إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

کتاب مستطاب

سیرۃ النبی ﷺ

یعنی

سوانح اقدس حضرت سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد پنجم

مشتمل بر منصب نبوت حصہ عبادات

جس میں پہلے عبادات کا مفہوم بتایا گیا ہے، پھر نماز، زکوۃ، روزہ، حج، جہاد، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر، شکر وغیرہ بدنی ومالی وقلبی عبادات کی تشریح، اور ان کے احکام ومصالح کی توضیح کی گئی ہے،

((تالیف))

(مولانا) سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

المتوفی ۲۳ نومبر سنہ ۱۹۵۳ء

(طبع پنجم) در مطبع معارف اعظم گڈھ طبع گردید سنہ ۱۳۸۴ھ / ۱۹۶۴ء

(کتبہ اقبال احمد)

فہرست مضامین

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد پنجم

اوقات کی تکمیل
۱۲۴ - ۱۳۰

زکوٰۃ
۲۰۱ - ۲۸۲

طاہر عباس اعوان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچۂ طبع دوم

سیرۃ النبیؐ کی یہ پانچویں جلد جب ۱۳۵۴ھ میں بڑی تقطیع پر چھپی تھی، اس وقت سے لوگوں کا تقاضا تھا کہ اس کی چھوٹی تقطیع بھی جلد شائع ہو، مگر نظرثانی کے لئے مجھے وقت نہیں ملتا تھا، اسلئے یہ کام جلد از جلد انجام نہ پاسکا، اب جب اس سے فرصت ملی، اور بعض دوستوں نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا، تو تین برس میں یہ کام انجام کو پہنچا، بعض فروگذاشتیں جو طبع اول میں ہوگئی تھیں، اُن کی اصلاح کردی گئی ہے، پھر بھی عصمت کا دعویٰ کون کرسکتا ہے،

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری لغزشوں سے درگذر فرمائے، اور میری لغزشوں کو دوسرے کی لغزشوں کا سبب نہ بنائے، رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا،

داعی

سید سلیمان ندوی

دارالمصنفین اعظم گڈھ

۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ
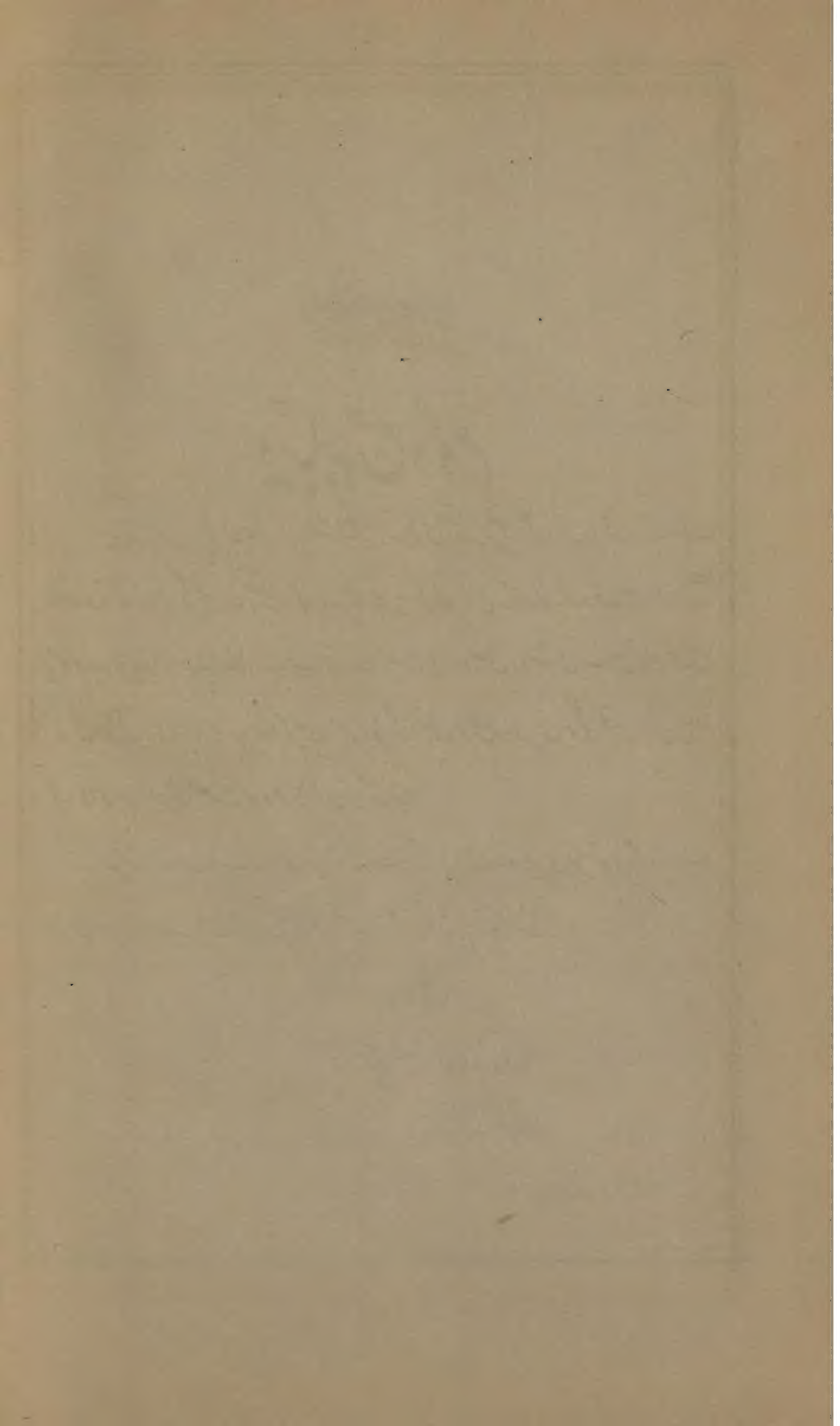
سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

دیباچہ

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی جلد ربیع الاول ۱۳۴۱ھ میں شائع ہوئی تھی آج تین سال کے بعد اس کی پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ اپنے ایک گنہگار بندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے، اور اپنے بندوں کے دلوں کو اس کے حسن قبول کے لئے کھول دیتا ہے۔

موضوع اس جلد کا موضوع عبادات ہے، اس میں عبادت کی وہ حقیقت اور اسلام میں اس کے وہ تمام انواع اور ان میں سے ہر ایک کی وہ مصلحت و حکمت اور اس باب میں تمام مذاہب سابق کی وہ کمی جو ذات پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی ہے بہ تفصیل رقم کی گئی اور بیان کی ہے، اپنی کوشش تو یہی رہی ہے کہ قدم اس راستہ سے نہ ہٹے جو صراط مستقیم ہے، اور وہ سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقیٰ ہے، تاہم دین

کہتا ہوں جو بعض صحابہؓ اور اکابر نے رضی اللہ عنہم کہا ہے، فرمایا کہ جو بات کہی گئی ہے اگر صحیح ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور غلط ہے، تو نفس خطا کار کا قصور ہے،

ان جلدوں کا سیرت سے تعلق

ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن میں یہ بات کئی دفعہ دہرائی گئی ہے کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی اور سیرت کے ان واقعات سے نہیں جن کو عام صورت سیرت کہتے ہیں، بلکہ اسلام کے پیغام اور اس پیغام کے پیغامبر دونوں سے یکساں ہے، بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دو سوالوں کا جواب ہے، اسلام کا پیغمبر کون تھا، اور وہ کیا لایا تھا، سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں، اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں،

اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل میں میں نے امکان بھر اس خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو تھا، ان زبانی بیانوں اور ہدایتوں کے علاوہ جو نجی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے، وہ خود اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں،

> چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مباحث سیرت میں آجائیں یعنی تمام مباحث مسائل پر یعنی قرآن مجید پر پوری نظر ہو، شاید سیرت نہ ہو بلکہ فلسفۂ مذہب ہو، اور مرتبی وارثۃ العلوم سیرت نبویہ موزوں ہوگا، گو لمبا ہو، ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا، (بنام مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم)

سیرۃ جلد اول کے مقدمہ میں انھوں نے ان حصوں کا عنوان منصب نبوت رکھا تھا، اور

> دوسرا حصہ منصب نبوت متعلق ہے نبوت کا فرض تعلیم عقائد اور اوامر و نواہی اور اخلاق اس بنا پر منصب نبوت کے ان ہی کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے اس حصہ

میں فرائض خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتداء و تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ، اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ اور موازنہ اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے، اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا، اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے کافی ہو سکتا ہے

(جلد اول طبع اول ص ۳، طبع دوم ص ۹)

گذشتہ چوتھی جلد، یہ پانچویں جلد اور آیندہ دو جلدیں درحقیقت اسی منصب نبوت کے مباحث کی تفصیل و تشریح ہیں، منصب نبوت، عرب کی گذشتہ حالت، اور تعلیم عقائد چوتھی جلد کا موضوع تھی، اور فرائض خمسہ، ان کی مصلحتیں اور حکمتیں اس جلد کا عنوان ہے، اخلاق و معاشرت کے نکتوں کے لئے چھٹی جلد، اور بقیہ اوامر و نواہی کے لئے جو معاملات سے متعلق ہیں، ساتویں جلد ہوگی، ان سب موضوعات کی تفصیل و تشریح میں مصنف اول کے ایما کے مطابق قرآن مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے، ان کی تاریخی تدریج پیش نظر رہتی ہے، ان کی مصلحتوں اور حکمتوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذاہب سے مناظرانہ پہلو کے بجائے مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے، اور ہر ایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب میں کیا تعلیم پیش کی ہے، اور وہ کیونکر تمام عالم کی اصلاح کے لئے کافی ہے،

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

تحدیث نعمت | اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اس سلسلہ کو حسنِ قبول کی سند عطا فرمائی

ع قبولِ خاطر و لطف خداداد است می دانم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی، کہ ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے
پوری عقیدت تھی، اور جن کی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدعیانہ فقرہ نہیں نکلا، مجھ سے فرمایا
کہ یہ کتاب بار قبول ہو گئی۔ اُن کے اس ارشاد کی تصدیق زمانہ کے واقعات سے ہوتی گئی۔ علاوہ اس کے
کہ اس کی ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے، ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے مسلمانوں
میں اس کے ساتھ خاص شیفتگی اور عقیدت پیدا ہو گئی۔ ترکی میں اس کی تین جلدوں کا ترجمہ
قسطنطنیہ سے شائع ہوا۔ فارسی میں اُس کی چند جلدیں کابل میں ترجمہ ہو گئیں، اور ابھی تک
منتظرِ طبع ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی میں مکہ معظمہ میں اس کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا ہے۔

اُس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لے کر آج
تک اس زبان میں جس میں اس موضوع پر کوئی ادبی ترجمہ کتاب نہ تھی چھوٹی بڑی سینکڑوں
کتابیں نئے نئے دعووں کے ساتھ اس کو سامنے رکھ کر لوگ لکھ رہے ہیں، اور سیرت کا ایک
عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان میں بحمد اللہ پیدا ہو گیا ہے، اور اُس کی تعلیم و مطالعہ اور اشاعت
کی طرف مسلمانوں کا عام رجحان ہو گیا ہے۔

امرائے اسلام کی امداد اس کتاب کے حسنِ قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنف مرحوم نے اُس کی
تصنیف کا جونہی اعلان کیا اُس کی خدمت کے لئے اعانت کی سب سے پہلی آواز اُس مبارک
کی زبان سے نکلی جس کا ہر تارِ نفس محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ تھا، یعنی
ملتِ محمدی کی خادمہ اور امتِ محمدی کی مخدومہ حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ
فرمانروائے کشور بھوپال، خدا ان پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے، از خود مرحمت شاہانہ سے مصنف کی ذات تک

خیال گذرا کہ شاید یہ توجہ باقی نہ رہے، مگر فرمایا کہ یہ کام اُس مصنف کے لئے نہ تھا، جو مر چکا بلکہ اُس خدا کے لئے تھا جس کو موت نہیں، اس لئے اپنی شاہانہ امداد برابر جاری رکھی، مصنف مغفور نے سیرت کی تصنیف کے متعلق ایک قطعہ کہا تھا،

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت — کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی — تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے، ایک سلطاں ہے

جب اس فقیر بے نوا کی وفات ہوئی تو سرکار عالیہ نے بڑے درد سے فرمایا تھا کہ "فقیر بے نوا تو چل بسا اب سلطان کی باری ہے" آخر یہ سلطان بھی چل بسی، اور "تالیف و تنقید روایت" کیساتھ "زر افشانی" کے کام کی ناتمامی کا خطرہ بھی پیدا ہوگیا، مگر خدا کا شکر ہے کہ فردوس مکانی نے اپنا جانشین یادگار چھوڑا، وہ تاج و تخت ایک ایسے جوان بخت کے سپرد کر گئیں جس نے فرض حکومت کی گرانباری کے ساتھ اس ناتمام کام کی تکمیل کا بوجھ بھی اٹھایا، اور سیرۃ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف کی امداد میں وہی توجہ مبذول رکھی، مسند صولت نشیں اعلیٰحضرت نواب حاجی حمید اللہ خاں بہادر فرمانروائے بھوپال کی عمر و دولت و اقبال میں اللہ تبارک و تعالیٰ شانہ برکت عطا فرمائے کہ ان کے زیر سایہ امت کی سینکڑوں آرزوئیں پرورش پا رہی ہیں خلد اللہ ملکہ۔

۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں سیرت کی پہلی جلد جب چھپ کر شائع ہوئی تو مصنف نے اس کا ایک نسخہ اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع مظفر الممالک نظام الملک نظام الدولہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کی

پیشگاہِ خسروی میں پیش کیا، حضور ممدوح کو اپنے مولیٰ و آقا حضرت سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، سید المرسلین، محبوب رب العلمین، احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ الوف التحیات والصلوٰۃ کی ذاتِ قدسی آیات سے والہانہ عقیدت ہے، سیرت کی پہلی جلد پڑھ کر بہت مسرور و محظوظ ہوئے اور دوسری جلدوں کے جلد چھپ جانے کی غرض سے دو دو برس کے لئے تین دفعہ اور تین برس کے لئے ایک دفعہ دو سو ماہوار جاری فرمائے، جن سے پچھلے برسوں میں جب ملک کی اقتصادی حالت نے ہم کو خطرہ میں پھنسا دیا تھا، بیحد مدد ملی،

اللہ تبارک تعالیٰ کی بارگاہِ بے نیاز میں التجا ہے کہ وہ باقی جلدوں کی جلد تکمیل کی توفیق عطا فرمائے، عمر کا رہوار زندگی کی پچاس سے زیادہ منزلیں طے کر چکا، جو کچھ باقی ہے دعا ہے کہ وہ بھی اسی سفر میں گذر جائے، اور آخر میں خوش قسمت سعدی کی طرح ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع ملے،

منزل تمام گشت و بپایاں رسید عمر ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

مؤلف

سید سلیمان ندوی

شبلی منزل اعظم گڈہ

۲۳ رجب [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عملِ صالح

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم کو لے کر آئے، اُس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات و فلاح دو چیزوں پر موقوف ہے، ایک ایمان، اور دوسری عملِ صالح، کتاب سیرۃ النبیؐ کی گذشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح و توضیح میں تھی، اب یہ پانچواں حصہ عملِ صالح کی تشریح و بیان میں ہے، ایمان بنیادی اصولوں پر یقین کامل رکھنے کا نام ہے، اور عمل صالح ان اصولوں کے مطابق عمل کا، کسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی کے لئے کافی نہیں جب تک اُس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو،

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو ان ہی دو چیزوں یعنی ایمان و عملِ صالح پر مبنی قرار دیا ہے

لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ عمل صالح کو نہیں، حالانکہ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت سے تقریباً یکساں اہمیت رکھتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے اور عمل صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون۔ جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہو سکتی،

ان دونوں کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور شکل کی ہے۔ ایمان کی حیثیت اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کی ہے جن کو سمجھے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا ثبوت محال ہے، لیکن اگر صرف اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کو تسلیم کر لیا جائے اور ان کے مطابق شکلوں کا عمل نہ کیا جائے تو فن تعمیر و ہندسہ، اور مساحت و پیمائش میں اقلیدس کا فن ایک ذرہ کارآمد نہیں ہو سکتا، اور نہ اس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جو اس فن سے اصل مقصود ہیں،

عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں قرآن پاک کی تعلیم تفصیلاً پیش کی جائے، قرآن پاک نے انسان کی نجات و کامیابی کے ذریعہ کو بیسیوں آیتوں میں بیان کیا ہے مگر ہر جگہ بلا استثناء ایمان اور عمل صالح دونوں پر اس کو مبنی قرار دیا ہے اور ہر جگہ ایمان کو مقدم، اور عمل صالح کو دوسری مگر ضروری حیثیت دی ہے، فرمایا:-

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ	زمانہ (یعنی پوری انسانی تاریخ) گواہ ہے
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	کہ انسان گھاٹے میں ہے مگر وہ
(عصر-۱)	جو ایمان لائے، اور اچھے کام کئے۔

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہد عادل ہے کہ ان ہی افراد اور قوموں

ہر خوف و فرح اور کامیابی کے دروازے کھلے ہیں جنہیں ربانی حقائق کا یقین تھا، اور اس یقین کے مطابق اُن کے عمل بھی نیک ہوتے رہے، ایک دوسری آیت میں فرمایا،

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ	بیشک ہم نے انسان کو بہترین حالت
تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ	میں پیدا کیا، پھر اس کو سب
سَافِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ	نیچوں کے نیچے لوٹا دیا، بجز جو ایمان
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ	لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لئے
مَمْنُوْنٍ (والتین - ۱)	نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے،

اس آیت میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے اس کی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے، لیکن اس بدترین منزل کی پستی سے کون بچائے جاتے ہیں، وہ جن میں ایمان کی رفعت اور عمل صالح کی بلندی ہو، یہود جن کو دعویٰ تھا، کہ بہشت اُن ہی کے ٹھیکہ میں ہے، یہ فرمایا،

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہی
اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (البقرہ - ۱)	جنت والے ہیں،

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں، بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے، جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کرے گا، وہ اُسی کی ملکیت ہو جائیگی:-

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا	بیشک جو مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں
وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ	اور صابئین اور نصاریٰ جو کوئی اللہ پر

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (مائدہ - ۱۰)

اور پچھلے دن پر ایمان لائے، اور اچھے کام کرے، نہ تو ان پر ڈر ہے نہ وہ غم کھائیں گے،

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح و نجات کا حصول کسی نسل و قومیت پر موقوف نہیں، اور نہ کسی مذہب و ملت کی طرف رسمی نسبت پر ہے، بلکہ احکامِ الٰہی پر یقین لانے اور اُن کے مطابق عمل کرنے پر ہے، عدمِ ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی، اور ایمان و نکوکاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جس میں نہ کبھی بال برابر فرق ہوا، اور نہ ہوگا، چنانچہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا،

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا، وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ الْحُسْنٰى، (کہف - ۱۰)

اس نے کہا کہ جو کوئی گناہ کا کام کرے گا تو ہم اس کو دنیا میں سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹا کر جائے گا تو وہ اُس کو بُری طرح سزا دے گا، اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کئے تو اس کے لئے بدلہ کے طور پر بھلائی ہے،

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كَاتِبُوْنَ، (انبیاء)

تو جو کوئی نیک عمل کرے اور وہ مومن بھی ہو تو اُس کی کوشش اکارت نہ ہوگی، اور ہم اُس کے (نیک عمل) لکھتے جاتے ہیں،

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ
اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا
الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ
غَيًّا اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَ
عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ
الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا،
(مریم-۴)

تو اُن کے بعد اُن کے ایسے جانشین ہوئے
جنھوں نے نماز کو برباد کیا، اور نفسانی
خواہشوں کی پیروی کی، تو وہ گمراہی
سے ملیں گے، لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان
لایا، اور نیک کام کئے تو وہی لوگ جنّت
میں داخل ہوں گے، اور ان کا ذرا سا
حق بھی مارا نہ جائے گا،

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جنّت کا استحقاق دراصل ان ہی کو ہے جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہیں، اور جو عمل سے محروم ہیں، وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہیں، اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا
يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ
هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ذٰلِكَ
الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
(شوریٰ-۳)

اور جو ایمان لائے اور نیک
کام کئے، وہ جنّت کے باغوں میں ہونگے
اُن کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس
وہ ہے جو وہ چاہیں، یہی بڑی مہربانی
ہے، یہی وہ ہے جس کی خوشخبری اللہ
اپنے بندوں کو دیتا ہے، جو ایمان
لائے اور نیک عمل کئے،

دوسری جگہ فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا، (کہف-۱۲)

بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، اُن کی مہمانی کے لئے باغِ فردوس ہیں،

پھر آگے چل کر فرمایا:-

فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا، (کہف-۱۲)

تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو تو چاہیئے کہ وہ نیک عمل کرے، اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے،

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرضی ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے عمل کی کمی ہے اسی کے بقدر ایمان میں بھی کمزوری ہے، کسی چیز پر پورا پورا یقین آجانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے، آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے، لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی نہیں جانتا، وہ بار بار اس میں ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو جاتا ہے، اس لئے عمل کا قصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے،

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان یا تنہا عمل کو نہیں بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات و فلاح کا ذریعہ بتایا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ، (حج-۷)

تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ آرام کے باغوں میں ہوں گے،

اسی طرح قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۵۰ موقعوں پر یہ آیت ہے

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ — جو ایمان لائے، اور جنھوں نے اچھے کام کئے

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم ملزوم ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے، اور نجات اور فوز و فلاح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ میں پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے

جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی وہی ہیں جن میں ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ — تم میں سے ان سے جو ایمان لائے
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ — اور نیک کام کئے، خدا نے وعدہ کیا
فِي الْأَرْضِ (نور - ۷) — کہ ان کو زمین کا مالک بنائے گا،

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی ان ہی سے تھا،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا — اللہ نے ان میں سے ان سے جو ایمان
الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا — لائے اور نیک کام کئے، بخشائش، اور
عَظِيمًا (فتح - ۴) — بڑی مزدوری کا وعدہ کیا،

بعض آیتوں میں ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی، اور عمل صالح کی جگہ احسان یعنی نیکوکاری کو جگہ دی گئی ہے، مثلاً ایک آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے، فرمایا،

بلیٰ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ	ہاں کیوں نہیں جس نے اپنے کو خدا کے سپرد
وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ	کیا اور وہ نیکوکار ہے، تو اس کی مزدوری
رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا	اس کے پروردگار کے پاس ہے نہ ڈر ہے
هُمْ يَحْزَنُوْنَ، (بقرہ-۱۳)	اُن کو اور نہ غم،

ان تمام آیتوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح پر ہے، اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب میں افراط اور تفریط نمایاں تھی، عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط میں[1] ہے صرف ایمان نجات کا مدار ہے، اور بودھ اور ہندو دھرم میں صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے، اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے، مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونوں اعمال کو قرار دیا ہے، یعنی سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصولوں کے صحیح ہونے کا یقین ہو، اس کے بعد یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو۔ یہ مثل ساری ہے اور ہر قسم کی کامیابیوں کا مدار ان ہی دو پر ہے، تو جس طرح کوئی مریض صرف اصول طبی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پا سکتا جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے، اسی طرح صرف اصول ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لیے کافی نہیں، جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ	وہ ایمان والے مراد کو پہونچے، جو نماز

---

[1] رومیوں کے ۱، ۳ و ۴،

فی صلاتہم خاشعون والذین ۔۔۔ میں عاجزی کرتے ہیں، جو لغو باتوں کی
ہم عن اللغو معرضون والذین ۔۔۔ طرف رخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے
ہم للزکوٰۃ فاعلون والذین ۔۔۔ ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت
ہم لفروجہم حافظون..... ۔۔۔ کرتے ہیں،......
والذین ہم لاماناتہم وعہدہم ۔۔۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس
راعون والذین ہم علیٰ صلواتہم ۔۔۔ کرتے ہیں جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں
یحافظون اولٰئک ہم الوارثون۔ (مومنون ۱) ۔۔۔ یہی بہشت کے وارث ہیں،

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادی علل واسباب کے تابع فرمایا ہے یہاں کی کامیابی اور فوز و فلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہوسکتی جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے ہماری بھوک دفع نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کے لیے ہم کو جد و جہد کرکے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر پیٹ میں اُتارنا بھی پڑے گا، اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتی ہیں، ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچ نہیں سکتے، جب تک اس یقین کے ساتھ ہم اپنی ٹانگوں کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دیں، یہی صورت ہماری دوسری دنیا یعنی عالم عقبیٰ کی ہے اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کیلئے بیکار ہے البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو شخص خدا کو صرف صحیح باور کرتا ہے، وہ اُس سے بہرحال بہتر ہے جو اُن کو سرے سے نہیں مانتا، کیونکہ اول الذکر سے کبھی نہ کبھی راہ راست پر آجانے اور نیک عمل بجالانے کی امید ہوسکتی ہے اور دوسرے

کے لئے تو ابھی بہت ہی منزل باقی ہے، اس لئے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید نسبۃً خدا کے فضل و کرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا۔

اعمالِ صالحہ کی قسمیں

"عملِ صالح" کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس کے اندر انسانی اعمالِ خیر کے تمام جزئیات داخل ہیں، تاہم اُن کی بھی تقسیمات حسب ذیل ہیں: عبادات، اخلاق، معاملات۔

اسلام میں لفظ عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے، اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو، اس لئے اخلاق و معاملات بھی اگر اس خوش نیتی سے انجام کئے جائیں تو وہ عبادت میں داخل ہیں، مگر فقہا نے اصطلاحاً یہ تینوں الگ الگ مستقل ابواب قرار دیئے ہیں جن کی تفصیل یوں کی جاسکتی ہے کہ اولاً اعمالِ صالحہ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کا تعلق خاص خدا سے ہے، اس کو عبادت کہتے ہیں، دوسری وہ جس کا تعلق بندوں سے ہے، اس کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کی حیثیت صرف اخلاقی فرض کی ہوتی ہے، اور دوسری وہ جس میں قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے، پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے۔

اعمالِ صالحہ کی ان ہی تینوں قسموں کی تفصیل و تشریح سیرۃ النبی کی موجودہ و آئندہ جلدوں کا موضوع ہے۔

عبادات

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ (بقرہ-۳)

عبادت کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص عمل سمجھے جاتے ہیں جن کو انسان خدا کی عظمت اور برتری کی بارگاہ میں بجا لاتا ہے لیکن یہ عبادت کا نہایت تنگ مفہوم ہے، اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی اس کا اہم جوہر یہی نہیں ہے کہ گذشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقوں کے بجائے اسلام میں عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے، بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ عبادت کی حقیقت درحقیقت کیا ہے، ساتھ ہی عبادت کے گذشتہ ناقص طریقوں کی تکمیل، مبہم بیانات کی تشریح، اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کر دی گئی۔

اہل عرب جہاں آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتوں سے بے خبر تھے، وہاں عبادت کے مفہوم و معنی اور اس کے صحیح طریقوں سے بھی ناواقف تھے، عرب میں جو یہود اور عیسائی تھے وہ بھی اس کے متعلق سچے معنی اور تعلیمات کی کوئی واضح حقیقت ان کے سامنے پیش نہ کر سکتے تھے۔

دینداری رکھتی تھی، سورۂ حدید میں قرآن پاک نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو فاسق کہا ہے لیکن
ان دونوں کے فسق میں نہایت نازک فرق ہے، یہود کا فسق دین میں کمی اور سستی کرنا اور نصاریٰ
کا فسق دین میں زیادتی اور غلو کرنا تھا، اور خدا کے مشروع دین میں کمی اور زیادتی دونوں گناہ
ہیں، اس لئے قرآن نے دونوں کو برابر کا فسق قرار دیا ہے

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ
وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ
وَالْكِتَابَ فَمِنْهُمْ مُهْتَدٍ وَكَثِيرٌ
مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ
آثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى
ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ
وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ
رَأْفَةً وَرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةً
ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ
إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا
حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا
مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ
فَاسِقُونَ ۝ (حدید - ۴)

اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا، اور
اُن کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھی تو
ان میں سے کچھ ہدایت پر ہیں، اور اکثر نافر
مان ہیں، پھر ان کے بعد ان کے پیچھے ہم نے اور
پیغمبر بھیجے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا اور
اُن کو انجیل عنایت فرمائی، اور جنھوں نے عیسیٰ
کی پیروی کی اُن کے دل میں نرمی، اور
مہربانی ڈالی اور ایک رہبانیت انھوں نے نئی
نکالی، ہم نے ان پر نہیں لکھی تھی لیکن
خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو انھوں نے اس کو
رہبانیت کو بھی جیسا نباہنا چاہا تھا نہیں
نباہا، تو ان میں جو ایمان لائے ان کو ہم نے
اُن کی مزدوری دی، اور اُن میں بہت سے

وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (مائدہ ۱۰)

کو چھوڑ کر ان چیزوں کو پوجتے ہو جن کے ہاتھ میں نہ نقصان ہے نہ نفع، اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے (جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے)، آپ فرمائیے کہ اے کتاب والو اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کے خیال پر نہ چلو جو پہلے بہک گئے اور

ان کی حالت یہ تھی:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ ۵)

خدا کو چھوڑ کر پیشواؤں اور درویشوں کو خدا بنا لیا تھا،

اس زمانہ میں عیسائیوں کے جو گرجے اور پرستش گاہیں عرب میں اور خصوصاً حبش میں تھیں، ان میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ اور حواریوں، ولیوں اور شہیدوں کی تصویریں اور مجسمے نصب تھے، عبادت گذار ان کے سامنے دعائیں اور مراقبہ میں سربسجود رہتے تھے، صحابہ میں سے جن لوگوں کو حبشہ کی ہجرت کے اثناء میں ان معبدوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوتا، ان میں سے شاید بعض بی بیوں کی نگاہ میں ان بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرض الموت میں بعض ازواج مطہرات نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا اور ان کی تصویروں اور بتوں کے حسن و خوبی کو بیان کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے، انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا، تم ایسا نہ کرنا۔ اور ان میں

جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا، تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے، اور اس میں اس کی تصویریں کھڑی کر دیتے تھے،[1]

ایڈورڈ گبن نے تاریخ ترقی و زوال روم کی متعدد جلدوں کے خاص ابواب میں عیسوی مذہب کے عبادات کے جو حالات بیان کئے ہیں، وہ تمامتر حدیث مذکور کی تصدیق و تائید میں ہیں، خصوصاً تیسری اور پانچویں جلد میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ، سینٹ پال، اور متعدد دینی شہیدوں کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے، وہ بالکل اس کے مطابق ہے، اور آج تک رومن کیتھولک اور قدیم مسیحی فرقوں کی پرستش گاہوں کے در و دیوار سے قرآن پاک کی صداقت کی آوازیں آرہی ہیں، اور آج بھی دیندار عیسائی دن رات مومی بتیوں کی روشنی میں ان کے آگے مراقبوں اور تسبیحوں میں سرنگوں نظر آتے ہیں، روم (اٹلی) کے تاریخی گرجاؤں میں یہ منظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور اس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی اصلی تشریح میری آنکھوں کے سامنے تھی،

یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر عرب کے لوگ اگرچہ خدا کی ہستی سے واقف ضرور تھے، مگر اس کی عبادت اور پرستش کے طریقوں سے بے خبر تھے، لات، عزیٰ، ہبل، اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتوں کو حاجت روا اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے، ان پر جانور قربانی کرتے، اور اپنی اولادوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے، سال کے مختلف اوقات میں خاص بتخانوں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے، اور پتھروں کے پھیرے کے ساتھ بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے، خانہ کعبہ

[1] صحیح مسلم کتاب المساجد،

رہتی تھیں۔ بُت پرستی کا معبد تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز تھا اور اُن کی نماز یہ تھی کہ خانہ کعبہ کے صحن میں تالی اور سیٹی دے دے کر بجا بجا کر بتوں کو خوش رکھتی تھیں۔ قریش کا ایک موحد زید بن عمرو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے بُت پرستی سے تائب ہو چکا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ اے خدا مجھے نہیں معلوم کہ میں تجھ کو کس طرح پوجوں اگر جانتا تو اُسی طرح عبادت کرتا۔

ایک صحابی شاعر عامر بن اکوع نے خیبر کے سفر میں یہ ترانہ گایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن رہے تھے

واللہ لولا اللہ ما اهتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا

خدا کی قسم اگر خدا نہ ہوتا تو ہم ہدایت نہ پاتے نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے

اس شعر میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ صرف رسول اللہ کی تعلیم تھی جس نے اہل عرب کو عبادت کے صحیح طریقوں سے آشنا کیا۔

عرب سے باہر بھی کہیں خدائے واحد کی پرستش نہ تھی، بت پرست یونانی اور بادشاہوں امیروں کے مجسّموں اور ستاروں کی ہیکلیں پوجتے تھے، روم، ایشیائے کوچک، یورپ، افریقہ، مصر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکوں میں حضرت عیسیٰ، حضرت مریم، اور سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی مورتیں اور ہڈیاں اور اُن کی مصنوعی لکڑیاں پوجی جاتی تھیں، زردشت کی امت آگ کی پرستش کرتی تھی، ہندوستان سے لے کر کابل و ترکستان اور چین اور جزائر سندھ تک بودھ کی مورتیاں معابد میں اور اس کی اصلی ہڈیوں کی راکھ کی پوجا ہوتی تھی، چین کے منگولس بھی باپ دادوں کی مورتوں کے آگے سر جھکاتے تھے، خاص ہندوستان میں سورج دیوتا، گنگا مائی، اور

سے سیرۃ ابن ہشام ذکر زید بن عمرو۔ سے مسلم، باب خیبر، شعر کا پہلا مصرع مختلف روایتوں میں مختلف ہے

ستاروں کی پوجا ہو رہی تھی، عراق کے صابی سبع سیارہ کی پرستش کی زندگی میں مبتلا تھے، [illegible] تمام دنیا درختوں، پتھروں، جانوروں، بھوتوں، اور دیوتاؤں کی پرستش کر رہی تھی، غرض عین اس وقت جب تمام دنیا خدائے واحد کو چھوڑ کر آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش میں مصروف تھی، ایک بے آب و گیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ
الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ
قَبْلِكُمْ، (بقرہ - ۳)

لوگو! اپنے اس پروردگار کی پرستش
کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو
پیدا کیا۔

سابق کتب الٰہی کے امانت داروں کو آواز دی گئی،

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ
سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ
إِلَّا اللَّهَ۔
(آلِ عمران - ۔)

اے کتاب والو! آؤ ہم تم اس بات پر
متحد ہو جائیں جس میں ہم تم عقیدۃً
متفق ہیں، کہ ہم خدائے برحق کے سوا کسی
اور کی پرستش نہ کریں،

مگر یہ آواز ریگستان عرب کے صرف چند حق پرستوں نے سنی، اور پکار اٹھے،

رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي
لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا
رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا۔
(آل عمران - ۲۰)

خداوندا! ہم نے ایمان کی منادی کی آواز
سنی کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، تو ہم
ایمان لے آئے، تو اے پروردگار ہمارے
گناہ معاف کر،

ان دقتوں کو سامنے لاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو بدر کے امتحان گاہ میں آپ کی زبانِ عبودیت ترجمان سے بارگاہِ الٰہی میں کی گئی تھی

"خداوندا! تیرے پوجنے والوں کی یہ مٹھی بھر جماعت آج تیرے [illegible] سے لڑنے پر آمادہ ہے
خداوندا! آج اگر یہ مٹ گئی تو پھر زمین میں تیری کبھی پرستش نہ ہوگی۔"[1]

خدا نے اپنے نبی کی دعا سنی اور قبول فرمائی، کیونکہ ختم الانبیاء کے بعد کوئی دوسرا نبی نہ تھا جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا، اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا۔

صرف ایک خدا کی عبادت

مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ میں نبوتِ محمدی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے دنیا کے معبدوں سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال کر پھینک دیا، باطل معبودوں کی عبادت اور پرستش یک قلم موقوف کر دی، اور صرف اس ایک خدا کے سامنے تمام مخلوقات کی گردنیں جھکا دیں، اور صاف اعلان کر دیا کہ

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — آسمان اور زمین کی تمام مخلوق اس مہربان
اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (مریم-۶) — خدا کے سامنے غلام بن کر آنے والی ہے

خدا کے سوا نہ تو آسمان میں نہ زمین میں، نہ آسمان کے اوپر، اور نہ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ اور کورنش و تعظیم کی مستحق ہے، اور نہ اُس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جا سکتا ہے، اور نہ اُس کی پرستش کے لئے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جا سکتی ہے، اور نہ اس کی نذر مانی جا سکتی ہے، اور نہ اس کی پرستش کی جا سکتی ہے۔ ہر عبادت صرف اسی

[1] صحیح مسلم و جامع ترمذی، غزوۂ بدر۔

کے لئے اور پرستش صرف اسی کی خاطر ہے،

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَ	بے شبہہ میری نماز اور میری قربانی اور
مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔	میری زندگی، اور میری موت سب کچھ
(انعام - ۲۰)	ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے

کفار کو بتوں، دیوتاؤں، ستاروں اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا، اور انھیں ہر دلیل سے سمجھایا گیا، کہ خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہیں لیکن جب اُن پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا،

قُلْ یٰاَیُّہَا الْکٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ	اے کافرو! جس کو تم پوجتے ہو اس کو
مَا تَعْبُدُوْنَ، وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ	میں نہیں پوجتا، اور نہ تم اس کو پوجنے
مَآ اَعْبُدُ، وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا	والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں، اور
عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ	نہ میں اس کو پوجنے والا ہوں جس کو تم نے
مَآ اَعْبُدُ، لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ	پوجا، اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو
(کافرون - ۱)	میں پوجتا ہوں، تمہارے لئے تمہارا

دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے

خارجی رسوم کا وجود نہیں

خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم وجان سے باہر کسی چیز کی ضرورت نہیں، نہ سورج کے نکلنے[1] اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت نہ دریا میں جا کر اس کا پانی اچھالنا مطلوب ہے، نہ سامنے آگ کو جلانے کی ضرورت[2]، نہ دیوتاؤں، دیبیوں، بزرگوں، اور ولیوں

[1] جیسا کہ ہندوؤں میں ہے، [2] جیسا کہ پارسیوں میں ہے،

کے مجسموں کو پیش نظر رکھنے کی اجازت ہے[1]، نہ سامنے موم بتیوں کے روشن کرنے کا حکم ہے[2]، نہ ناقوسوں کی ضرورت، نہ لوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم، نہ سونے چاندی کے ظروف کی ضرورت اور برتنوں کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے کپڑوں کی قید ہے[3]، ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے، اس کے لیے صرف ایک پاک ستر پوش اور پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے، اگر جسم و لباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے، تو یہ بھی معاف ہے۔

درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں

اسلام میں عبادت کیلئے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانگی کی حاجت نہیں، محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین میں ہندوؤں کی طرح نہ برہمن ہیں، نہ پروہت ہیں، نہ پجاری ہیں، نہ یہودیوں کی طرح کاہن ہیں، نہ ربی ہیں، نہ خاخام ہیں، نہ حضرت ہارون کے خاندان کی وساطت کی قید، نہ عیسائیوں کی طرح عبادتوں کی بجا آوری کے لیے پادریوں اور مختلف مذہبی عہدہ داروں کی ضرورت ہے، نہ پارسیوں کی طرح دستوروں اور موبدوں کی حاجت، یہاں ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہو کر آپ باتیں کرتا ہے، آپ عرض حال کرتا ہے، ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے، یہاں یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو، میں جواب دوں گا۔

اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن-۶)   تم مجھے پکارو، میں تم کو جواب دوں گا۔

مذہبی کشش کی کوئی چیز نہیں

اکثر مذاہب نے اپنی عبادتوں کو دلکش، دلفریب، مؤثر اور رعب بنانے

۱؎ جیسا کہ ہندوؤں، بت پرستوں اور رومن کیتھولک میں رواج ہے۔ ۲؎ جیسا کہ رومن کیتھولک عیسائیوں میں۔ ۳؎ یہ چیزیں یہودیوں کے ہاں ہیں۔ پارسیوں میں سفید کپڑوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔

کے لئے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا، کہیں ناقوس اور قرنا کی پُر رعب آوازیں تھیں، کہیں ساز و رقص اور نغمہ و بربط کی دلکش صدائیں تھیں، کہیں جرس اور گھنٹے کا غلغلہ، لیکن دین محمدی کی سادگی نے ان میں سے ہر ایک سے احتراز کیا، اور انسانی قوتِ تاثر کے لئے دلوں کے صدق اور روح کی صحت کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیروں کا سہارا نہیں لیا، تاکہ خدا اور بندہ کا رازونیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کے ساتھ خلوص و اثر کے مناظر پیدا کرے،

مکان کی قید نہیں ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چونے کی چہار دیواری میں محدود کیا ہے جو ان سے باہر ادا نہیں، آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں، گرجوں کے سوا کہیں دعا نہیں، اور صومعوں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ میں نہ کسی درودیوار کی ضرورت نہ محراب و منبر کی حاجت، وہ دیر و حرم، معبد و صومعہ اور مسجد و کنیسہ سب سے بے نیاز ہے، زمین کا ہر گوشہ بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اس کا معبد اور عبادت خانہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، مجھ کو اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھ سے پہلے پیغمبر کو نہیں دی گئیں، ایک یہ ہے:

وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا ۔ اور میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنا دی گئی[1]

تم سوار ہو کہ پیادہ، گلگشت چمن میں ہو کہ ہنگامۂ کارزار میں، خشکی میں ہو کہ تری پر، ہوا میں ہو کہ زمین پر، جہاز میں ہو کہ ریل پر، ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو اور اُس کے سامنے سجدۂ نیاز بجا لا سکتے ہو، یہاں تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد میں ہو جس میں سامنے تصویریں اور مجسمے نہ ہوں تو وہاں بھی نماز

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعلت لی الارض مسجداً وطہوراً۔

پیشوائے اسلام نے اس عبادت کی شکل کا استیصال کر دیا، اور بتایا کہ خدا کی راہ میں جان قربان کرنا اصل میں یہ ہے کہ کسی سچائی کی حمایت میں یا کمزوروں کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پروا نہ کی جائے، اور یہ نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے، یا دریا میں ڈوب مرا جائے، یا آگ میں اپنے کو جلا دیا جائے، آپ نے فرمایا کہ جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کریگا، اسکو جہنم میں اسی چیز سے سزا دی جائیگی[۱]

حیوانی قربانی میں اصلاح

کسی حیوان کی قربانی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب میں رائج تھا، عرب میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کر کے بتوں پر چڑھا دیتے تھے، کبھی یہ کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لا کر باندھ دیتے تھے اور اس کو چارہ گھاس نہیں دیتے تھے، وہ اسی طرح بھوک و پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا، اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا ان کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے، چنانچہ قربانی ذبح کر کے معبد کی دیوار پر اس کے خون کا چھاپ دیتے تھے، یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور قربانی کر کے اس کا گوشت جلا دیتے تھے اور اس کے متعلق وہ بہت رسوم ادا کرتے تھے، ان کی تفصیل صفحوں میں بھی نہیں سما سکتی تھی، ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا ہے، بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اس کا گوشت چیل اور کوؤں کو کھلا دیتے تھے، پیغام محمدی نے ان سب طریقوں کو مٹا دیا، اس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں، بلکہ تمہارے دل کی غذا مطلوب ہے، فرمایا،

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْكُمْ (حج ۵)	اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، بلکہ تمہارے دل کی پرہیزگاری

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب باب من کفر اخاہ ۔۔۔ جلد ۲، ۹۰۰

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ	اور قربانی کے جانوروں کو خدا کی نشانیاں
شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ	بنایا ہے، تمہارے لئے اُن میں بہت فائدے
فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ	ہیں، اُن کو قطار میں کھڑا کر کے تم اُن پر
فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا	خدا کا نام لو، تو جب وہ پہلو کے بل گر پڑیں
وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ	(یعنی ذبح ہو چکیں) تو اُن میں سے کچھ خود
سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	کھاؤ اور باقی قناعت پسند فقیروں اور
	محتاجوں کو کھلا دو، اسی طرح ہم نے
(حج - ۵)	اُن جانوروں کو تمہارے کام میں لگا دیا تاکہ تم شکر کرو

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت میں یہ فعل شرک اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے: وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ عرب میں دستور تھا کہ خاص رجب کے مہینے میں قربانی کرتے، اسلام کے بعد لوگوں نے اس سے متعلق آپ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا خدا کے نام سے جس مہینہ میں چاہو ذبح کرو، نیکی کا کام خدا کے لئے کرو اور (لوگوں کو) کھلاؤ[1]۔ غرض قربانی کی یہی وہ حقیقت ہے، صرف خون بہانے کے لئے خون بہانا قربانی کی حقیقت نہیں، ورنہ یہ خون بہانا مشرکوں کی بھینٹوں اور دیوتاؤں کی طرح اسلام کے خدا کو خوش آتا۔

مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت

اسی لئے وہ مشرکانہ قربانیاں جو عرب میں جاری تھیں بند کر دی گئیں۔ عرب میں جانوروں کی قربانی کرنے اور ان کو بتوں پر چڑھانے کے مختلف طریقے

---

[1] ابوداؤد، باب فی العتیرۃ، جلد دوم ص ۵۔

اونٹنی کا پہلا بچہ جو پیدا ہوتا تھا بتوں کے نام پر چھوڑتا، اس کی قربانی کر دیتے تھے، اور اس کی کھال درخت پر لٹکا دیتے تھے، اس قسم کے بچے کو فرع کہتے تھے، رجب کے پہلے عشرہ میں ایک اور قربانی کی جاتی تھی، جس کا نام عتیرہ تھا، اسلام نے ان دونوں قربانیوں کو ناجائز قرار دیا اور رجب کی تخصیص باطل کردی،

لَا فَرَعَ وَلَا عَتِيرَةَ، آپ نے فرمایا کہ فرع اور عتیرہ جائز نہیں۔[1]

بتوں کے نام پر مختلف قسم کے جانور چھوڑ دیے جاتے تھے، اور ان کو کوئی شخص کسی دوسرے کام میں استعمال نہیں کر سکتا تھا، قرآن مجید میں اس کے متعلق نص صریح یہ ایک آیت نازل ہوئی،

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَّلَا سَائِبَةٍ وَّلَا وَصِيلَةٍ وَّلَا حَامٍ (مائدہ)، نہ تو خدا نے بحیرہ، نہ سائبہ، نہ وصیلہ، نہ حام بنایا،

مردوں کی قبر کے پاس گائے، بکری، ذبح کرتے تھے لیکن، اسلام نے مراسم ماتم کی جو صورتیں اس کے ساتھ تھیں، ان کو بھی ناجائز قرار دیا، فرمایا،

لَا عَقْرَ فِي الْإِسْلَامِ، اسلام میں قبر کے پاس جانوروں کا ذبح کرنا جائز نہیں،[2]

عرب جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی و سخاوت کی نمائش اس طرح کرتے تھے کہ دو آدمی مقابل ہو کر جانوروں کے ذبح کی بازی لگاتے تھے، اپنا ایک اونٹ

---

[1] ابوداؤد کتاب الضحایا جلد ۲ ص ۵، [2] ابوداؤد کتاب الجنائز باب کراہیۃ الذبح عند القبر جلد ۲ صفحہ ۴۳،

ذبح کرتا۔ پھر اس کے مقابل میں دوسرا ذبح کرتا، اس طرح یہ مقابلہ قائم رہتا جب تک وہ ختم
ہو جاتے، یا ذبح کرنے سے عاجز ہو جاتا، وہ ہار جاتا، اسلام نے اس جاہلانہ تلفِ مال کے طریقہ کو روک دیا۔

تجرد، ترکِ لذائذ، ریاضات اور تعذیبِ شاقہ عبادت نہیں

عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے اسی قدر
خدا خوش ہوتا ہے، اور وہ اس کی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے، اسی
لئے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفیں دیتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار دیا جائے اسی
قدر روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی آتی ہے، یہ پچھلی نسلوں میں شائع تھا،
عیسائی رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا، کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کر لیتا،
کوئی ہفتہ میں یا چالیس دن میں ایک دفعہ غذا کرتا تھا، کوئی سرتاپا برہنہ رہتا، اور برہنگی
کو تقدس کا رنگ سمجھتا تھا، کوئی جاڑے کی سردی میں اپنے بدن کو ننگا رکھتا تھا، کوئی عمر بھر یا
سالوں تک چپ چاپ کھڑا رہتا تھا، یا بیٹھا رہتا تھا، کوئی بیٹھنے اور لیٹنے سے قطعی پرہیز کرتا، کوئی
اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا تھا کہ وہ سوکھ جائے، کوئی عمر بھر تاریک تنہا غاروں میں چھپ کر
خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا، کوئی تجرد اور ترکِ دنیا کر کے اہل و عیال، وطن و فرزند کے
تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا مدعی بنتا تھا، لیکن نبوت محمدی نے یہ بتایا کہ ان
میں سے کوئی چیز عبادت نہیں، نہ ترکِ لذائذ حق کی لذت بخشتی ہے، نہ ہماری تکلیف خدا کی خوشنودی
کا باعث ہے، ورنہ بندوں کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو رحم آتا، نہ زن و فرزند کی نفرت سے خدا
کی محبت نصیب ہوتی ہے، نہ ترکِ دنیا سے دین کی دولت ملتی ہے، خدا کا دین تو یہی ہے جو بندہ

؎ ابوداؤد کتاب الاضاحی جلد ۲ ص ۵،

إنّما أنا بعثت بالملّة السمحة	میں تو آسان اور روشن حنیفی دین
او السّهلة الحنيفية البيضاء	دیکر بھیجا گیا ہوں،

مذہب میں رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا، خود وہ کبھی بہ خوشی حق سے کیا گیا ہو، مگر وہ دین حق کی بتائی تعلیم نہ تھی، اس لئے اسلام کے صحیفہ نے اس کو بدعت سے تعبیر کیا اور کہا،

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا مَا	اور عیسائیوں نے ایک رہبانیت کی بدعت
كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ	نکالی، اور خدا کی خوشنودی
رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ	حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم نہیں دیا
رِعَايَتِهَا،	تھا، تو جیسا چاہئے اس رہبانیت
(حدید - ۴)	کا حق ادا نہ کیا،

ان لوگوں سے جنھوں نے جسم کی لذتوں اور زیب و زینت کی جائز چیزوں کو بھی اپنے اوپر حرام کر لیا تھا کہ اس سے خدا خوش ہوگا، یہ سوال کیا،

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ	پوچھ اے پیغمبر کہ اس زیب و زینت
أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ	اور رزق کی اچھی چیزوں کو جن کو خدا نے
الرِّزْقِ، (اعراف - ۴)	اپنے بندوں کے لئے بنایا، کس نے حرام کیا

اسلام نے اس مسئلہ میں یہاں تک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کی خوشنودی مزاج کیلئے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی، اس پر عتاب آیا اور ارشاد فرمایا،

۱؎ مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۲۶۶،

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ	اے پیغمبر خدا نے جس چیز کو تیرے لئے
اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ	حلال کیا تو اس کو اپنی بیویوں کی خوشی
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○	کی خاطر اپنے اوپر حرام کیوں کرتا ہے؟
(تحریم ۔ ۱)	اور خدا بخشنے والا مہربان ہے،

صحابہ میں بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبوں کے اثر یا ذاتی میلان طبع کے سبب تجرد، ترک لذائذ اور اجتناب شادی کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اس سے باز رکھا اور فرمایا کہ میں یہ شریعت لے کر نہیں آیا، قدامہ بن مظعون اور اُن کے ایک رفیق نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی، یا رسول اللہ! ہم میں سے ایک نے عمر بھر تجرد رہنے اور شادی نہ کرنے کا، اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے، آپ نے فرمایا میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں، یہ سن کر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے،

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ جو ایک نہایت عابد و زاہد صحابی تھے، یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ اے عبد اللہ! تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، مہینہ میں تین روزے رکھ لینا کافی ہے۔[1] اسی قسم کی نصیحت آپ نے ایک دوسرے تقشف پسند صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو فرمائی، آپ کو اُن کی نسبت معلوم ہوا کہ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں، بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، دن کو روزے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم، صحیح مسلم

رکھتے ہیں، رات کو سوتے نہیں، آپؐ نے اُن کو بلا کر پوچھا کہ "کیوں عثمان! تم میرے طریقہ سے ہٹ
گئے" عرض کی "خدا کی قسم میں نہیں ہٹا ہوں، میں آپ ہی کے طریقہ کا طالب رہتا ہوں" فرمایا "میں
سوتا بھی ہوں، اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں، اور افطار بھی کرتا ہوں، اور عورتوں
سے نکاح بھی کرتا ہوں، اے عثمان خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے،
تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تو روزے بھی رکھو، افطار
بھی کرو، نماز بھی پڑھو، اور سوؤ بھی۔[1]

قبیلۂ باہلہ کے ایک صحابی جب اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے تو انہوں نے دن کا
کھانا چھوڑ دیا، اور مسلسل روزے رکھنے لگے، ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمتِ اقدس میں
حاضر ہوئے، تو اُن کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ اُن کو پہچان نہ سکے، انہوں نے اپنا نام
بتایا تو فرمایا "تم خوش رو تھے، تمہاری صورت کیوں ایسی ہوگئی" عرض کی "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
جب آپ سے مل کر گیا ہوں، برابر روزے رکھتا ہوں" فرمایا "تم نے اپنی جان کو کیوں عذاب میں
ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک روزہ کافی ہے" انہوں نے اس سے زیادہ کی طاقت
ظاہر کی تو آپ نے مہینہ میں دو روزہ کی اجازت دی، انہوں نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی
تو آپ نے مہینہ میں تین روزے کر دیئے، انہوں نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست
کی، تو آپؐ نے ماہِ حرام کے روزوں کی اجازت دی۔[2] ایک دفعہ چند صحابہؓ نے ازواجِ مطہرات
کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی دن رات کی عبادت و ریاضت کا حال دریافت

---

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب ما یؤمر من القصد فی الصلوٰۃ۔ [2] ابوداؤد باب صوم اشہر الحرم۔

گیا، وہ سمجھتے تھے کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا لیکن جب آپ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ سے کیا نسبت؟ آپ تو معصوم ہیں، ان میں سے ایک صاحب نے کہا میں تو رات بھر نماز پڑھوں گا۔ دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزے رکھوں گا۔ تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ میں عمر بھر مجرد رہوں گا کبھی نکاح نہ کروں گا۔ آنحضرت صلی (اللہ علیہ وسلم) ان کی یہ گفتگو سن رہے تھے، ان کو خطاب کرکے فرمایا: خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں تاہم میں روزہ رکھتا ہوں، اور افطار بھی کرتا ہوں، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو میرے طریقے پر نہیں چلتا، وہ میری جماعت میں نہیں۔[1]

بعض صحابہ نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے، اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے، چاہا کہ اپنا عضو قطع کرا دیں، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی اجازت چاہی، تو آپ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ وغیرہ صحابہ کہتے ہیں، اگر حضور اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے۔[2]

ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ آپ نے کس [illegible] کے ساتھ لوگوں کو عبادت کا مفہوم و مقصود تعلیم فرمایا۔

آپ کبھی کبھی بذات خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھتے تھے، صحابہ نے بھی آپ کی پیروی میں اس قسم کے روزے رکھنے چاہے، آپ نے منع فرمایا، لیکن وہ سمجھے کہ آپ صرف اپنی شفقت

---

[1] سنن نسائی کتاب النکاح۔ [2] صحیح بخاری و ابوداؤد، کتاب النکاح۔

کی بنا پر منع فرماتے ہیں، اس لئے بعضوں نے افطار نہ کیا، آپ نے دو دن برابر روزے رکھے اتفاق سے چاند نکل آیا، آپ نے افطار کر لیا اور فرمایا کہ اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے روزے رکھتا کہ ان میں غلو کرنے والوں کا سارا غرور جاتا رہتا، صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! پھر آپ کیوں کئی کئی دن تک روزے رکھتے ہیں، فرمایا تم میں سے کون میری طرح ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے، اسی لیے اسلام میں عام امت کے لئے یہ روزے نہیں ہیں۔

ایک دفعہ ایک مسجد میں آپ کا گذر ہوا، دیکھا تو ایک کھمبے میں ایک رسی لٹک رہی ہے، دریافت فرمایا تو لوگوں نے کہا یہ زینب نے باندھی ہے، رات کو نمازیں پڑھتی ہیں جب کھڑی کھڑی تھک جاتی ہیں تو اسی کے سہارے کھڑی ہوتی ہیں، یہ سن کر آپ نے فرمایا "یہ رسی کھول دو لوگو! تم اسی وقت تک نماز پڑھو جب تک تم میں نشاط باقی رہے، جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے"[۲]۔

ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گذری حضرت عائشہؓ نے کہا یہ حولاء ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ "یہ رات بھر نہیں سوتی اور عبادت میں مصروف رہتی ہے"، فرمایا کہ "یہ رات بھر نہیں سوتی، لوگو! اسی قدر کرو جتنی طاقت ہے"[۳]۔

جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نمازوں میں مشغول رہتے تھے، اُن کو مخاطب کرکے فرمایا،

اکلفوا من العمل ما تطیقون — اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو کر سکو۔

۱؎ صحیح بخاری کتاب الصوم [illegible] ۲؎ بخاری [illegible] جلد اول ص ۲۰ [illegible] باب التشدید فی العبادۃ ۳؎ [illegible] صحیحین و موطا و نسائی۔

نیت کی ہے۔ فرمایا "خدا کو اس کی حاجت نہیں کہ یہ اپنی جان کو اس طرح عذاب میں ڈالے، اس کو سوار کردو"[۱]

ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے، آپ نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے، اور اس کی یہ کیا حالت ہے، لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ابواسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہے، کہ وہ کھڑا رہے گا بیٹھے گا نہیں، اور نہ سایہ میں آرام کرے گا، اور نہ بات کرے گا، اور برابر روزے رکھے گا، آپ نے فرمایا کہ "اس سے کہو کہ بات کرے، بیٹھے، سایہ میں آرام لے، اور اپنا روزہ پورا کرے"[۲]

حج میں دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک میں نکیل ڈالے ہوئے ہے، اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اس کی نکیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے، آپ نے جاکر نکیل کاٹ دی، اور فرمایا کہ اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اس کو طواف کراؤ[۳]

اسی قسم کی غیر ضروری ریاضتوں کے متعلق عیسائی راہبوں کی گذشتہ حالت بتا کر آپ نے فرمایا

لاتشددوا علی انفسکم فانما	اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ تم سے پہلے
هلک من کان قبلکم بتشدیدهم	قومیں اپنی جانوں پر سختیاں کرنے سے تباہ ہوئیں
علی انفسهم وستجدون بقایاهم	اور ان کی بقیہ نسلیں آج بھی گرجوں اور
فی الصوامع والدیارات[۴]	دیروں میں تم کو ملیں گی،

---

۱ ابوداؤد ترمذی ونسائی وغیرہ باب النذور ۲ صحیح بخاری ابوداؤد وابن ماجہ کتاب الایمان
۳ صحیح بخاری باب الایمان والنذور ۴ مجمع الزوائد بحوالہ معجم کبیر ومسند طبرانی وابوداؤد باب الحسد فی

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقوں کا اس ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، آپ نے فرمایا،

لا صرورۃ فی الاسلام (ابوداؤد) اسلام میں رہبانیت نہیں،

عزلت نشینی و ترکِ دنیا عبادت نہیں

اکثر مذہب نے دینداری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی غار یا کھوہ یا جنگل میں بیٹھ جائے، اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرے، اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں قرار دیا، عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندوں کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام تعلقوں سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے نامحرم رہتا ہے اس لئے وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان تعلقات کے ازدحام اور علائق کے ہجوم میں گرفتار ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متعلق جو اس کا فرض ہے، اس کو انجام دیتا رہے، جو شخص ان تعلقات و علائق، و حقوق و فرائض کے ہجوم سے گھبرا کر کسی گوشۂ عافیت کی تلاش کرتا ہے، وہ دنیا کے کارزار کا نامرد اور بزدل سپاہی ہے، اسلام اپنے پیرووں کو جوانمرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے جو ان سب جھمیلوں کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولیں، غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترکِ فرض نہیں، بلکہ ادائے فرض ہے، ترکِ عمل نہیں بلکہ عمل ہے، یعنی کچھ نہ کرنا نہیں بلکہ کرنا ہے،

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض ان صحابہ کو جو اہل و عیال اور دوست احباب سب کو چھوڑ کر دن بھر روزہ رکھتے تھے، اور راتوں کو عبادت کرتے تھے فرمایا:

میں، تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمہاری بیوی بچوں کا بھی حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، تمہاری
جان کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام کی نظر میں عبادت اُن حقوق
کو بجا لانا ہے، ان حقوق کو ترک کر دینا نہیں، چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک صحابی کا گذر ایسے
مقام پر ہوا جس میں موقع سے ایک غار تھا، قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا، آس پاس کچھ جنگل کی
بوٹیاں بھی تھیں، اُن کو اپنی عزلت نشینی کے لئے یہ جگہ بہت پسند آئی، خدمت بابرکت میں آکر عرض
کی، یا رسول اللہ! مجھ کو ایک غار ہاتھ آگیا ہے، جہاں ضرورت کی سب چیزیں ہیں، جی چاہتا
ہے کہ وہاں گوشہ گیر ہو کر ترک دنیا کر لوں، آپ نے فرمایا میں یہودیت اور عیسائیت لیکر دنیا میں
نہیں آیا ہوں، میں آسان اور سہل، اور روشن ابراہیمی مذہب لیکر آیا ہوں۔[1]

اسلام سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں کئی کئی دن جاکر رہا کرتے تھے،
عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے، لیکن جب وحی کے ذریعہ پیام آپکے پاس آیا اور دعوت
تبلیغ کا بار آپکے مبارک کندھوں پر رکھا گیا، شب و روز میں رات کی چند ساعتیں اور سال
میں رمضان کے چند اخیر دن گوشۂ عزلت اور زاویۂ تنہائی میں بسر ہوتے تھے، ورنہ تمام
دن پوری ہمت کے ساتھ مل کر حق کی عبادت اور پھر مخلوق کی خدمت میں صرف ہوتے
تھے، اور یہی تمام خلفاء اور عام صحابہؓ کا طرز عمل رہا، اور یہی سادگی اور سیدھی سادی عبادت

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۲۶۶، اسلام میں گوشہ گیری اور عزلت نشینی کی اجازت صرف دو موقعوں پر ہے، ایک
شخص کے لئے جس میں فطرۃً بدی ہو جس کی سرشت دوسروں کو نفع پہنچانا نہیں بلکہ تکلیف دینا ہو، آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے اس کو گوشہ نشینی کی تدبیر بتائی کہ وہ لوگوں سے قطع تعلق کرلے، صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بدو
نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا ایک تو وہ جو اپنی جان و مال سے خدا کی راہ

اس کی تشریح آپ نے ان لوگوں سے کی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تھے

لکل امرء ما نوی فمن کان	ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت
هجرته الی الله ورسوله فهجرته	کی اگر ہجرت سے مقصود خدا اور رسول ہے
الی الله ومن کانت هجرته الی	پہنچا ہے تو اس کی ہجرت خدا کی طرف ہے
دنیا یصیبها او امرأة ینکحها	اگر کسی نے دنیا کی غرض سے ہجرت کی یا کسی
فهجرته الی ما هاجر الیه	عورت کیلئے ہے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے
(بخاری باب اول)	جس کی نیت سے اس نے ہجرت کی۔

اس تشریح سے یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کا جو مفہوم ہمارے سامنے پیش کیا ہے، اس میں پہلی چیز دل کی نیت اور خلوص ہے، اس میں کسی خاص کام اور طرز و طریق کی تخصیص نہیں ہے، بلکہ انسان کا ہر وہ جائز کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی اور اس کے احکام کی اطاعت ہو، عبادت ہے، اگر تم اپنی شہرت کیلئے کسی کو لاکھوں دیدو، تو وہ عبادت نہیں، لیکن خدا کی رضا جوئی اور اس کے حکم کی بجا آوری کے لئے چند کوڑیاں بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہے۔ تعلیم محمدی کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور عمل کے اخلاص کی غرض و غایت بنا دیا ہے اور یہی عبادت سے اسلام کا اصل مقصود ہے

یا ایها الناس اعبدوا ربکم الذی	اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت
خلقکم والذین من قبلکم لعلکم	کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا
تتقون۔ (بقرہ۔ ۳)	کیا تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ عبادت کی غرض و غایت محض حصولِ تقویٰ ہے۔

تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور بُرے کاموں سے نفرت ہوتی ہے۔ آنحضرت صلعم نے سینہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تقویٰ کی جگہ یہ ہے۔ اور قرآن نے بھی تقوی القلوب دلوں کا تقویٰ کہہ کر اسی نکتہ کو ادا کیا۔ اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام میں عبادت کی اصلی غرض ہے۔ نماز، روزہ اور تمام عبادتیں سب اسی کے حصول کی خاطر ہیں۔ اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جن سے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو، سب عبادت ہیں۔

اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت میں یوں ادا کر سکتے ہیں، کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند ان مخصوص اعمال کا نام ہے جن کو انسان خدا کے لئے کرتا ہے، مثلاً نماز، روزہ، قربانی، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بہت وسیع کر دیا، اس تعلیم کے رو سے ہر وہ نیک کام جو خالص خدا کے لئے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو، اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کیلئے کیا جائے عبادت ہے۔ اسلام میں خدا کے لئے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خود خدا کی بڑائی اور اسی کے لئے ہو، کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لئے ہو لیکن اس کام کے کرنے سے اس کام کے کرنے والے کا مقصود پیش نظر دکھاوا، حصولِ شہرت، یا دوسروں کو احسان مند بنانا وغیرہ کوئی دنیاوی، و مادی غرض نہ ہو بلکہ محض خدا کی محبت، خوشنودی اور رضا مندی ہو۔

اس تشریح کے رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذہب نے قائم

سلہ ترمذی باب بر و صلہ، باب تحریم ظلم مسلم، مسند ج ۲، ص ۳۱۰

عبادت ہے، ایک اور آیت میں توکل یعنی کاموں کے لئے کوشش کر کے نتیجہ کو خدا پر سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے، فرمایا،

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ھود) — اس کی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ رکھو،

اسی طرح مشکلات میں صبر و استقلال بھی عبادت ہے، فرمایا،

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ (مریم) — اس کی عبادت کر اور صبر کر،

کسی شکستہ دل سے اس کی تسکین و تشفی کی بات کرنا، اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے، ارشاد ہے،

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا أَذًى (بقرہ ۳۶) — اچھی بات کہنا اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو،

اس آیت پاک کی تشریح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمائی ہے،

كل معروف صدقة (بخاری کتاب الادب) — ہر نیکی کا کام خیرات ہے،

تبسمك في وجه اخيك صدقة، — تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی خیرات ہے،

واماطة الاذى عن الطريق صدقة — راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی خیرات ہے،

غریب اور بیوہ کی مدد بھی عبادت بلکہ بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے، فرمایا،

الساعي على الارملة والمسكين — بیوہ اور غریب کے لئے کوشش کرنے والے

كالمجاهد في سبيل الله كالذي — کا مرتبہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے

یصُوموا النّہار ویقوموا اللّیل،	کے برابر ہے جو دن بھر نفل
(بخاری، ادب)	روزہ اور رات بھر نفل نماز پڑھتا ہو،

باہم لوگوں کے درمیان سے بغض و فساد کے اسباب کو دور کرنا، اور محبت پیدا کرنا ایسی عبادت ہے جس کا درجہ نفل نماز، نفل روزہ، اور صدقہ سے بھی بڑھ کر ہے، آپ نے ایک دن صحابہ سے فرمایا،

الا اخبرکم بافضل من درجة	کیا میں تم کو نفل روزہ، نماز اور صدقہ سے
الصّیام والصّلوٰة والصّدقة	بھی بڑھ کر درجہ کی چیز بتاؤں،

صحابہؓ نے عرض کی، یا رسول اللہ! ارشاد فرمائیے، فرمایا،

اصلاح ذات البین،	وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے،[1]

حضرت سلمان فارسیؓ، ایک دوسرے صحابی حضرت ابو درداءؓ سے ملنے گئے، تو دیکھا کہ ان کی بیوی نہایت معمولی اور میلے کپڑے پہنے ہیں، حضرت سلمانؓ نے وجہ دریافت کی تو بولیں کہ تمہارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہیں ہے، اس کے بعد مہمان کیلئے کھانا آیا، تو ابو درداءؓ نے کہا میں روزہ سے ہوں، حضرت سلمانؓ نے کہا میں تو تمہارے بغیر نہیں کھاؤں گا، آخر انہوں نے افطار کیا، رات ہوئی تو ابو درداءؓ نماز کو کھڑے ہونے لگے، حضرت سلمانؓ نے کہا، ابھی سو رہو، پچھلے پہر کو حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا، اور کہا اب نماز پڑھو چنانچہ دونوں نے تہجد کی نماز ادا کی، پھر حضرت سلمانؓ نے کہا، اے ابو درداءؓ تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تو جس جس کا حق تم پر ہے سب کو ادا کرو، حضرت ابو درداءؓ نے آنحضرت صلعم سے آ کر

[1] سنن ابی داؤد جلد دوم کتاب الادب باب اصلاح ذات البین ص ۱۹۲،

کی خدمت میں آکر حضرت سلمانؓ کی یہ تقریر نقل کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ "سلمانؓ نے سچ کہا"۔

لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ کہ یا رسول اللہ تمام کاموں میں سب سے بہتر کون کام ہے، فرمایا "خدا پر ایمان لانا، اور اس کی راہ میں جہاد کرنا"۔ لوگوں نے پوچھا کس غلام کے آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہے؟ ارشاد ہوا جس کی قیمت زیادہ ہو، اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو۔ انہوں نے کہا اگر یہ کام ہم سے نہ ہوسکے تو فرمایا بہتر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مدد کرو، یا جس سے کوئی کام بن نہ آتا ہو، اس کا کام کردو۔ پھر سوال ہوا کہ اگر یہ بھی نہ ہوسکے فرمایا تو پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو، یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو خود تم اپنے اوپر کرسکتے ہو۔

ایک دفعہ آپؐ نے صحابہ سے فرمایا خدا اپنے بندوں سے کہے گا کہ میں نے تم سے کھانا مانگا، تم نے نہ کھلایا، وہ عرض کریں گے خداوندا! تو نے کیسے کھانا مانگا، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے، فرمائے گا کیا تم کو علم نہیں کہ میرے فلاں بندہ نے تم سے کھانا مانگا، تم نے اس کو نہ کھلایا، اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے، اے ابن آدم! میں نے تم سے پانی مانگا، تو نے مجھے پانی نہ پلایا، وہ کہے گا "اے پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاؤں تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے" فرمائے گا تجھ کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلاں بندہ نے پیاس میں تجھ سے پانی مانگا، تو نے اس کو پانی نہ پلایا، اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں بیمار ہوا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، وہ کہے گا "اے پروردگار میں کیونکر تیری بیمار پرسی کروں تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے، فرمائے گا تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت کی

۱؎ بخاری کتاب الادب باب صنع الطعام و مشکوٰۃ المصابیح صفحہ ۱۰۹ و ۵۲۳ ؎ بخاری باب معونۃ الرجل اخاہ

اگر کرتا تو تو اُس کو میرے پاس پاتا، یا مجھے اُس کے پاس پاتا۔

اس مؤثر طریقۂ ادا نے خدا شناسی اور خدا آگاہی کے کتنے نئے پردے چاک کر دیئے، اور دکھا دیا کہ خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے کیا طریقے ہیں؟ حضرت سعدؓ چاہتے تھے کہ اپنی کل دولت خدا کی راہ میں دیدیں، آپ نے انہیں بتایا کہ "اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مقصود ہے، اس کا تم کو ثواب ملے گا، یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں دو اس کا بھی ثواب ہے۔ ابو مسعود انصاریؓ سے ارشاد فرمایا: مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا خرچ پورا کرے، تو وہ بھی صدقہ ہے۔ غریب و نادار صحابہؓ نے دربار رسالت میں ایک دن شکایت کی، کہ یا رسول اللہ! دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے، ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی روزے رکھتے ہیں، اُن کے علاوہ مالی عبادت بھی بجا لاتے ہیں، جو ہم نہیں بجا لا سکتے۔" فرمایا کیا تم کو خدا نے وہ دولت نہیں دی ہے جس کو صدقہ کر سکو، سبحان اللہ اور الحمد للہ کہنا بھی صدقہ ہے۔ یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے یہ کرتا ہے، فرمایا کہ اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی حاجت پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا۔[۱]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ حسن نیت، ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اس درجہ کتنی وسعت پیدا کی ہے اور کتنی تہ بہ تہ نفسانی حیلوں کا ازالہ کیا [illegible]

---

۱ ادب المفرد امام بخاری باب عیادۃ المرضیٰ سے ادب المفرد باب [illegible] صحیح مسلم [illegible] کتاب [illegible]
ادب المفرد امام بخاری باب کل معروف صدقۃ۔

اور کاموں کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہیں،

۱- بندوں کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا خالق و معبود سے ہے، ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان نماز ہے،

۲- وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لئے کرتا ہے، صدقہ اور زکوٰۃ ہے،

۳- خدا کی راہ میں ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا، کسی اچھے مقصد کے حصول کے لئے تکلیف اور مشقت جھیلنا، اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشوں کی نجاست و آلودگی سے پاک رکھنا جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ میں حائل ہوتی ہیں، روزہ ہے، یا یوں کہو کہ ایثار و قربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے،

۴- دنیائے اسلام میں ملت براہیمی کی برادری اور اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم، مرکزی رشتہ کا قیام، اور اس مرکزی آبادی اور کسب روزی کے لئے ذاتی کوشش اور محنت کے ایک سرعنوان کا نام حج ہے،

غور کر کے دیکھئے، انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کام انہی اصول چہارگانہ کے تحت میں داخل ہیں، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر ہے، توحید و رسالت کا اقرار کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا، اور حج کرنا،[1] یہی چیزیں ہیں جن کے عنوان کے تحت اسلام کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے، اور تعبیر بدل دیجئے تو ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال [illegible]

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم کتاب الایمان،

جو ان ہی ستونوں پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے؛

اس تقریر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ یہ چاروں عبادتیں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہیں ہیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چاروں عبادتیں اپنے تمام جزئیات باب اور متعلقات کے ساتھ فرض ہیں، جو شخص صرف ان چاروں فرائض کو جو عنوان باب ہیں، ادا کرتا ہے، اور باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلو تہی کرتا ہے، اس کی عبادت ناقص اور اس کی اطاعت ناقص ہے، اور اس کے لئے دین و دنیا کی فلاح و کامیابی جس کا خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے مشکوک ہے یہیں سے یہ شبہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازیں ہم کو برائیوں سے کیوں باز نہیں رکھتیں، ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیوں نہیں بخشتے، ہماری زکوٰۃ ہمارے دلوں کو پاک و صاف کیوں نہیں کرتی ہمارا حج ہمارے گناہوں کی مغفرت کا باعث کیوں نہیں بنتا، اور قرن اول کی طرح ہماری نمازیں ملکوں کو فتح، اور ہماری زکوتیں ہمارے قومی افلاس کو دور کیوں نہیں کرتیں، اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موجود و برکات کا انبار کیوں نہیں لگ جاتا، لیکن خدا کا یہ وعدہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ مشروط ہے، فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ۔ (نور - ۷)

اللہ نے تم میں سے ان سے جو ایمان لائے، اور نیک کام کئے، یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا،

اس لئے ایمان کامل اور عمل نیک کے بغیر اس وعدہ کی ایفا کی توقع رکھنا نادانی ہے، اسی طرح ان چاروں بنیادی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کرکے [illegible]

کی تمیں ممکن ہے کہ دنیائے فانی کی بادشاہی کمال بنا دے، مگر آسمان کی بادشاہت میں اس کو کوئی حصہ نہیں ملے گا، اور اسلام اس لئے آیا ہے کہ اپنے پیروؤں کے لئے یہ دونوں جہانوں کی بادشاہیاں رکھدے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عبادت مذہبیہ کو اس وسعت کے ساتھ سمجھا جائے، جو اسلام کا منشا ہے، اور اسی وسعت کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے، جو اسلام کا مطالبہ ہے،

لہ سیرۃ ابن ہشام وفد قریش خدمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد اول ص ۲۰۵ مطبوعہ مصر کلمۃ واحدۃ تعطونیہا تملکون بہا العرب وتدین لکم بہا العجم۔

نماز

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے جو امیر و غریب، بوڑھے جوان، عورت مرد، بیمار و تندرست سب پر یکساں فرض ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی۔ اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر ادا نہیں کر سکتے تو بیٹھ کر ادا کرو۔ اگر اس کی بھی قدرت نہیں تو لیٹ کر ادا کر سکتے ہو۔ اگر منہ سے نہیں بول سکتے تو اشاروں سے ادا کرو۔[1] اگر کسی سخت مجبوری میں رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھ لو۔[2] سخت خوف کی حالت میں اگر کسی سواری پر ہو تو جس طرف موقع ہو اسی رخ پڑھ لو۔[3]

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان، اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اُس رحمان و رحیم کی یاد اور اُس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسنِ ازل کی حمد و ثنا، اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار۔ یہ اپنے محبوب معبود سے روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے، یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے، ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ

[1] [illegible] ابو داؤد [illegible] تفسیر بقرہ آیت [illegible]

یہ بیقرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی، اور مایوس دل کی آس ہے، یہ فطرت کی زندہ و
حساس واثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے۔

کسی غیر مرئی طاقت کے آگے سرنگون ہونا، اس کے حضور میں دعا و فریاد کرنا، اور اس
سے مشکلوں میں تسلی پانا انسان کی فطرت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں کوئی
ساز ہے، جو نامعلوم انگلیوں کے چھونے سے بجتا رہتا ہے، یہی اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا فطری جواب ہے،
قرآن نے جابجا انسانوں کی اسی فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے، اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتیں آتی ہیں،
جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے، اور تمہارا جہاز بھنور میں پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو،

غرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے، جس کے سامنے وہ جھکے،
اندرونِ دل کی عرض نیاز کرے، اور اپنی دلی تمناؤں کو اس کے سامنے پیش کرے، غرض عبادت
روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہے، اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوش جنون کا علاج ممکن
نہیں، وحشی سے وحشی مذاہب میں بھی عبادت کے کچھ رسوم اس فطرت کی تسلی کے لئے موجود
ہیں، پھر آسمانی مذاہب اس سے کیونکر خالی ہو سکتے ہیں؟

چنانچہ دنیا کے ہر آسمانی مذہب میں خدا کی یاد کا حکم اور اس یاد کے کچھ مراسم موجود ہیں، مسلمانوں
میں اگر حمد و تسبیح ہے، تو یہودیوں میں مزمور، عیسائیوں میں دعائیں، پارسیوں میں زمزمہ اور ہندوؤں
میں بھجن ہیں، اور دن رات میں اس فریضہ کے ادا کرنے کے لئے ہر ایک میں بعض اوقات کا تعین بھی ہے،
اس بنا پر یقین کرنا چاہیے کہ نماز مذہب کے ان اصول میں سے ہے، جن پر تمام دنیا کے مذاہب متفق ہیں،
قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا، جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم

اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں، یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ (لقمان ۲) اے میرے بیٹے نماز کھڑی کر۔
حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ ۲) اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر۔
حضرت موسیٰ اور ہارونؑ اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے، وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (یونس ۹)
اور نماز کھڑی کیا کرو۔ بنی اسرائیل سے وعدہ تھا اِنِّیْ مَعَکُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ (مائدہ ۳)
میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کھڑی کیا کرو۔ حضرت زکریا کی نسبت ہے، وَھُوَ قَائِمٌ
یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ (آل عمران ۴) اور وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ
ہیں، وَاَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ (مریم ۲) اور خدا نے مجھ کو نماز کا حکم دیا ہے۔

آیات بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب
میں بعض یہود اور عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے۔

مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اُمَّۃٌ قَائِمَۃٌ	اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو
یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَاءَ الَّیْلِ	راتوں کو کھڑے ہو کر خدا کی آیتیں پڑھتے
وَھُمْ یَسْجُدُوْنَ (آل عمران ۱۲)	ہیں، اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔

حدیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے تذکرے ہیں، حضرت نے فرمایا کہ جب
نماز پڑھو تو تہ بند باندھ لو، یا چادر اوڑھ لو، یہودیوں کی طرح ننگے نہ پڑھو" (ص ۲) تم یہودیوں
کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر مت ڈال لو، بلکہ اس کو باندھ لیا کرو (ص ۲)، نماز میں
یہودیوں کی طرح مت جھومو (ص)، تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے اور جوتے پہنے
رہو، میری امت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی

رہ گئی تھی، ورنہ نماز سے زیادہ انھوں نے قربانی اور نذرانوں پر زور دیا تھا جن میں خلوص اور خدا ترسی
کا شائبہ تک نہ تھا، عیسائیوں نے خدا کی نماز کے ساتھ انسانوں کی نمازیں بھی شروع کردی تھیں، وہ
حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے علاوہ اور بھی سیکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی عبادت میں مصروف ہوگئے تھے
دین ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کرلیتے تھے، الغرض آپ کی
بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہو چکی تھی، اس کی شکل و صورت
اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ آج بھی ان کے صحیفوں میں اس کی اصلی شکل نظر نہیں آتی، نہ اس کے
ارکان کا پتہ لگتا ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی صحیفوں کے حامل اور معتقد اس فرض
کو کس طرح ادا کرتے تھے، کن موزوں دعاؤں کو پڑھتے تھے، اور اس کی ادائگی کے کیا اوقات
تھے، جو کچھ ان میں رہ گیا تھا، وہ صرف عملی رسم و رواج اور بعد کے مذہبی مقتداؤں کی تجویز
جن پر مذہبی فریضہ سمجھ کر عمل کیا جا رہا تھا، سجدہ جو نماز کی روح اور نیاز مندی کی انتہائی شرط
ہے، اس کو یہود و نصاریٰ دونوں نے مشکل اور باعث تخفیف سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، اور اس طرح
نماز کی ظاہری شکل و صورت بھی انھوں نے بگاڑ دی تھی، قرآن مجید میں ان کی اسی
صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے،

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ	تو ان کے بعد ان کے جانشین ہوئے جو
وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ	خدا کی کتاب باپ دادوں سے وراثت
هَٰذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا	میں لی، وہ صرف اس دنیا کی دولت کا

(۱) دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم لفظ عبادت (ورشپ)۔

وَإِنْ يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِثْلُهُ يَأْخُذُوهُ ، أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِيثَاقُ الْكِتَابِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ ، أَفَلَا تَعْقِلُونَ وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ، إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ،

(اعراف - ۲۱)

نذرانے لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف کر دیا جائے گا، اور اگر ویسا ہی نذرانہ اب بھی اُن کے سامنے آئے تو لے لیں (اور مذہب کی پروا نہ کریں) کیا اُن سے کتاب کا معاہدہ نہیں لیا گیا کہ وہ خدا کے متعلق سچ کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے، اور اُن لوگوں نے جو کچھ اس (کتاب) میں ہے اس کو پڑھا، اور آخرت کا گھر اُن لوگوں کے لئے ہے، جو پرہیزگار ہیں، کیا تم نہیں سمجھتے ؟ اور وہ لوگ جو کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لیں، اور انھوں نے نماز قائم کیا، تو اپنی حالت درست کرنے والوں کی مزدوری کو ہم

نمازیوں کا اجر

سورۂ مریم میں تمام انبیائے سابقین کے ذکر کے بعد خدا فرماتا ہے،

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (مریم ۴)

نماز کی بربادی

اُن کے بعد اُن کے جانشین ایسے ہوئے جنھوں نے نماز کو برباد کیا، اور اپنی خواہشوں کی

نماز کے ضائع و برباد کر دینے سے مقصود، نماز کو صرف چھوڑ دینا نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اُس کی

حقیقت اور اس کی روح کو گم کر دینا ہے، مسلمان جب اپنی نماز کے لیے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ (نماز کے لئے آؤ) کا ترانہ بلند کرتے تھے، تو یہود و نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے، اس پر قرآن نے ان کی نسبت یہ شہادت دی کہ ان کی خدا پرستی کی روح اتنی مردہ ہو چکی ہے کہ جب دوسرے لوگ خدا پرستی کے جذبہ میں سرشار ہوتے ہیں، تو وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں،

وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا	اور جب تم نماز کے لئے اذان دیتے ہو
هُزُوًا وَّلَعِبًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ	تو وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں یہ
لَّا يَعْقِلُوْنَ ○ (مائدہ-۹)	اس لئے کہ وہ حقیقت سے نادان ہو چکے ہیں،

اہل عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے، وہ گو نماز کی صورت سے کسی حد تک واقف تھے مگر بھولے سے بھی اس فرض کو ادا نہیں کرتے تھے، بتوں کی پوجا، جنات کی دہائی فرشتوں کی خوشامد ان کی عبادت کا خلاصہ تھا، حج و طواف یا دوسرے موقعوں پر وہ خدا سے دعائیں مانگتے، تو ان میں بھی بتوں کے نام لے لیتے، اور شرک کے نعرے لگا دیتے تھے، موحدانہ خضوع و خشوع کا ان کی دعاؤں میں شائبہ تک نہ تھا، مسلمانوں کو جب کبھی نماز پڑھتے دیکھ لیتے تو ان کو منہ چڑھاتے تھے، دق کرتے تھے، دھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے، چنانچہ ان کے متعلق قرآن نے کہا،

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ	اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹی اور
إِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً (انفال-۴)	تالی بجانا تھی،

اگلے مفسروں نے اس آیت کے دو سبب لکھے ہیں ایک یہ کہ وہ خود جو نماز پڑھتے تھے اس میں

سیٹی اور تالی بجایا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ مشرکین جب نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر
ان کی نماز خراب کرنی چاہتے تھے، اور گویا یہی ان کی نماز تھی۔ پہلے معنی کی بنا پر تو ان
کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کود اور لہو و لعب تھی، اور دوسرے معنی کی رو سے سرے سے ان کے
ہاں نماز ہی نہ تھی، بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا یہی ان کی نماز تھی،

ایک روایت میں ہے،

أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ عَبْدًا — کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ

إِذَا صَلَّىٰ (علق - ۱) — کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔

ایک بندہ سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، آپ جب صحنِ حرم میں
نماز پڑھتے، تو قریش جو بے فکری کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے رہتے، کبھی آپ کی ہنسی اڑا
یا کرتے تھے، کبھی آپ کی گردن میں پھندا ڈال دیتے، اور کبھی جب آپ سجدہ میں جاتے
تو پشتِ مبارک پر نجاست لا کر ڈال دیتے تھے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بیہودگی
سے تکلیف ہوتی تو ہنستے اور قہقہے لگاتے تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے
نماز میں تو خدا کا خیال تھا اور اس کے بعد ان کی ان حرکات کی وجہ سے ممانعت تھی اور دن
کو کسی نہ کسی درہ میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے، اور مسلمان بھی عموماً ادھر ادھر چھپ کر ہی نماز
پڑھتے تھے، یا پھر رات کے سناٹے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے، مشرکین اگر کبھی ان کو جانتے پاتے تو

---

۱ ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ۔ ۲ دیکھو بخاری کتاب المناقب باب مناقب ابوبکر، ۳ صحیح بخاری
کتاب الصلوٰۃ باب المرأۃ تطرح عن المصلی شیئاً من الاذی

دیکھ پاتے تو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے، ابن اسحاق میں ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھاٹیوں میں چھپ کر نماز پڑھتے تھے، ایک دفعہ حضرت سعد بن وقاص چند مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آگئی، اس نے ان نماز کو بدعت (نیا کام) سمجھا، اور مسلمانوں کو برا بھلا کہا، اور ان سے لڑنے پر آمادہ ہوگئی۔[1]

الغرض جب محمد رسول اللہ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) نے انسانوں کو خدا کے آگے سربسجود ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے، ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے، ان کی نمازیں بالعموم اخلاص و اثر، سکون و دلجمعی، خشوع و خضوع اور خوف و خشیت سے بالکل خالی تھے، دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کے ساتھ انسانوں کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے، اور ان کی عبادتیں کرتے تھے، اور وہ جبیں جو توحید کا آئینہ تھی، ان کے ہاں شرک کا مظہر بن گئیں تھی، تیسرے وہ (یعنی عرب بت پرست) جنھوں نے نہ کبھی خدا کا نام لیا، اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا، نہ روحانی لذت سے آشنا ہی تھے

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم

آنحضرت (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو ملا وہ نماز کا تھا، یَا اَیُّہَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ (مدثر) اے لحاف میں لپٹے ہوئے اٹھ اور ہوشیار کر، اور اپنے رب کی بڑائی بول۔ رب کی بڑائی بولنا ہی نماز کی بنیاد ہے، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدارج طے کرتی ہوئی اس نقطہ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے، آپ نے سونے والوں کو جگایا، بھٹکے ہوؤں کو

---

[1] سیرۃ ابن ہشام (ابتداء ما افترض اللہ سبحانہ من الصلوٰۃ)

بتایا، بچا نون کو سکھایا، اور خدا اور بندے کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا، گوشت پوست کے سونے
چاندی کے، اور اینٹ اور پتھر کے ان بتوں کو جو خدا کی جگہ کھڑے تھے، ڈھکیل کر نیچے گرا دیا،
صرف ایک خدا کی نماز دنیا میں باقی رکھی، اور خدا کے سوا ہر ایک کے سجدے کو حرام کر دیا، اس طرح
آپ کی تعلیم کے ذریعہ سے نماز کی اصل حقیقت دنیا میں ظاہر ہوئی، آپ نے اہلِ عرب اور دنیا
کے بت پرست قوموں کی نماز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان و آداب سکھائے، موثر دعائیں
تعلیم کیں، عیسائیوں کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرستش کا سبق دیا، یہودیوں کو نماز
کے خضوع و خشوع، راز و نیاز، اور اخلاص و اثر سے باخبر کیا، اور انبیائے عالم کی نماز کو اپنے
عمل کے ذریعہ سے مکمل صورت اور روح و حقیقت دونوں کے ساتھ ناقابلِ تحریف اور
غیر متغیر وجود بخش دیا، حکم ہوتا ہے کہ

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ (بقرہ۔۳۱) نمازوں کی نگہداشت کرو۔

یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے نگہداشت کا حکم ہوا اور مسلمانوں
کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ

وَهُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ (انعام) اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں

الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ (معارج ۱) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں،

وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ، (مومنون۔۱) (وہ کامیاب ہیں) وہ جو اپنی نمازوں کی نگہداشت کرتے ہیں،

خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حکم ہوتا ہے کہ خود بھی نماز پڑھو اور اپنے اہل و عیال کو بھی اس کا

اسلام میں نماز کا مرتبہ

اسلام سے پہلے بھی دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں آیا جس میں نماز کی تعلیم نہ دی گئی ہو، لیکن چونکہ وہ مذاہب خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے، اس لئے اُن کے مٹنے کے ساتھ اُس کی اہمیت بھی باقی نہ رہی، چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب میں آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرارِ عبودیت اور اس کی حمد و ثنا کو وہ صحیح تعین اور تاکیدی حیثیت حاصل نہیں، بلکہ کسی مذہب کے پیروؤں بلکہ نبیوں کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایاں نہیں ہوتی ورنہ جیسا کہ اوپر بھی گذر چکا، قرآن کی رو سے تو دنیا میں کوئی ایسا پیغمبر نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو، اور اس نے اپنی امت کو اس کی تاکید نہ کی ہو، مگر موجودہ حیثیت یہ فرض اسلام کے سوا کہیں نمایاں و صحیح اور مکمل صورت میں باقی نہیں رہا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء اور قرآن پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے، اس لئے اس فریضۂ الٰہی کو دینِ کامل میں ایسی منظم اور مشخص ہو کر نمایاں صورت دی گئی ہے کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم و باقی رہے۔

یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس میں کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے، کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا، قرآن پاک میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہے، اس کے ادا کرنے میں سستی اور کاہلی نفاق کی علامت اور اس کا ترک کفر کی نشانی بتائی گئی ہے، یہ وہ فرض ہے جو اسلام

سے منافقوں کی صفت میں آیا ہے وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ (نساء - ۲۰) جب وہ نماز کو اٹھتے ہیں تو سستی اور کاہلی کے ساتھ اٹھتے ہیں، فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (ماعون)

کیسا تعلق پیدا ہو اور اس کی تکمیل اس نسبت قدس میں ہوئی جس کو معراج کہتے ہیں[1]،

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اس کے لوازم ہیں[1] اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے،
چنانچہ سورۂ روم (رکوع ۴) میں پہلا حکم یہ دیا گیا، کہ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ
اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دین توحید پر سیدھا رکھو وہی اللہ
کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے) اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملحق یہ ہے،

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ	اور نماز کو قائم رکھو اور شرک والوں میں
الْمُشْرِكِيْنَ، (روم-۴)	سے نہ ہو جاؤ،

اس آیت پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے،
دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے، کہ ترک نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا
اندیشہ ہے کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعہ سے بڑھاتے نہ رہیں خود
اس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے، یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی تاکید
پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے، اور اس کے ترک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہتے[2]
چنانچہ آپ نے فرمایا کہ نماز دین کا ستون ہے، جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے
اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے، [illegible]

(بقیہ حاشیہ ص ۷۱ -) افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں،

[1] کفار کے بارے میں ہے لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (مدثر ۲) ہم نمازیوں میں نہ تھے، یہ اس وقت کہیں گے
جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ہوئے کتب صحاح واقعات معراج و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ

جب مدینہ منورہ والوں نے صلح کی بات چیت شروع کی، تو نماز، جہاد، اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا چاہا۔ آپ نے دو پچھلی باتوں سے مستثنیٰ کر دیا، لیکن نماز کے متعلق فرمایا "جس دین میں خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو، اُس میں کوئی بھلائی نہیں" آپنے یہ بھی فرمایا ہو کہ "نماز دل کی روشنی ہے" اپنی نسبت فرمایا ہے "نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہو" ایک حدیث میں آپنے فرمایا "انسان آگ میں جلتا رہتا ہو اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہو" یہ محبوب ازل کے ہجر و فراق کی آگ ہو، اور نماز ابر رحمت ہو جو آگ کو سرد کر دیتا ہے، آپنے فرمایا کہ "کفر اور ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی سے ہو کیونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں جس کا اظہار اس کے اعمال ہی سے ہو سکتا ہے، مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملتا نماز ہی ہے، عین اس وقت جب جناب رسالت پناہؐ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے، اور نفس مبارک کے آخری حروف زبانِ مبارک سے ادا ہو رہے تھے، آپ فرما رہے تھے، "نماز، اور غلام"!!

| نماز کی حقیقت |

نماز کے لئے اصل عربی لفظ "صلوٰۃ" ہے، صلوٰۃ کے معنی عربی اور عبرانی زبانوں میں دعا کے ہیں، اس لئے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجا ہو، اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نماز کی یہی تشریح فرمائی ہے۔ معاویہ ابن حکم سلمی ایک نومسلم صحابی تھے، ان کو اسلام کے جو آداب بتائے گئے ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ جب کبھی کسی مسلمان کو چھینک آئے اور الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہو، اتفاق سے ایک دفعہ نماز باجماعت ہو رہی تھی، معاویہ بھی اس میں شریک تھے

لے یہ تمام حدیثیں کنز العمال (کتاب الصلوٰۃ جلد ۴) میں مختلف کتب حدیث کے حوالوں سے درج ہیں

اُن کے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی، انھوں نے نماز کی حالت میں یرحمک اللہ کہہ دیا، صحابہ نے

گھورنا شروع کر دیا، معاویہ نے نماز ہی میں کہا، تم سب مجھے کیوں گھور رہے ہو، تو صحابہ

نے زانو پر ہاتھ مارے، وہ سبحان اللہ کہنا، اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جا رہا ہے، نماز ختم ہوئی

تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا کہ نماز میں کون باتیں کرتا تھا، لوگوں نے معاویہ کی طرف

اشارہ کیا، آپ نے اُن کو پاس بلا کر نہایت نرمی سے سمجھایا کہ نماز قرآن پڑھنے اور اللہ کو یاد کرنے

اُس کی بڑائی اور بزرگی بیان کرنے کا نام ہے، اس میں انسانوں کو باتیں کرنا مناسب نہیں[۱]، حضرت

انسؓ کہتے ہیں کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ الدعاء مخ العبادۃ دعا عبادت کا مغز ہے، اور حضرت نعمان

ابن بشیرؓ انصاری روایت کرتے ہیں کہ آپ نے الدعاء ھو العبادۃ دعا ہی عبادت ہے، اس کے

بعد آپ نے یہ کہکر کہ تمہارا پروردگار فرماتا ہے، اس تفسیر کی تائید میں یہ آیت پڑھی جس میں دعا

ہی کا نام عبادت بتایا گیا ہے،

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ	مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا، جو
يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ	لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں وہ
جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ، (مومن-۶)	عنقریب جہنم میں ذلیل و خوار ہو کر جائیں گے

مستدرک حاکم (کتاب الدعاء) میں ہے کہ آپ نے فرمایا بہترین عبادت دعا ہے، اس کے

بعد آیت مذکور تلاوت فرمائی،

۱؎ سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ باب تشمیت العاطس فی الصلوٰۃ، یہ بڑی حدیث ہے میں نے صرف دونوں کو جمع کر دیا ہے،
۲؎ یہ دونوں حدیثیں جامع ترمذی کتاب الدعوات میں ہیں، دوسری حدیث ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ باب الدعاء میں
اور مستدرک حاکم کتاب الدعاء میں بھی ہے،

آسمان، زمین، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، جنگل، جھاڑ، چرند، پرند سب اُس کے آگے سربسجود ہیں اور
اُس کے مقرر کردہ احکام و قوانین کی بے چون و چرا اطاعت کر رہے ہیں یہی اُن کی تسبیح و نماز ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ	اور دنیا میں کوئی چیز نہیں، مگر یہ کہ
وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَہُوْنَ تَسْبِیْحَہُمْ	وہ اس خدا کی حمد کی تسبیح پڑھتی ہے
(بنی اسرائیل ۵)	البتہ تم اس کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ	کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانوں میں ہے
فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ	اور جو زمین میں ہے اور سورج، چاند، تارے
وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ	پہاڑ، درخت، جانور، اور بہت سے
وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَکَثِیْرٌ	آدمی اس کو سجدہ کرتے ہیں، اور بہت
مِّنَ النَّاسِ وَکَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْہِ	سے آدمیوں پر اس کا عذاب ثابت ہو چکا
الْعَذَابُ۔ (حج ۲)	(کیونکہ وہ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے)

غور کیجئے! کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثناء خدا کے سامنے سرنگوں ہے لیکن استثناء ہے تو صرف انسان میں کہ بہتیرے اس کو سجدہ کرتے ہیں، اور بہتیرے اس سے روگرداں ہیں، اسی لئے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے، انسان کے علاوہ تمام مخلوقات بلا استثناء اطاعت گذار ہیں کیونکہ وہ ذاتی ارادہ و اختیار سے سرفراز نہیں خدا کے حکم کے مطابق وہ ازل سے اپنے کام میں مصروف ہیں اور قیامت تک مصروف رہے گی لیکن انسان ذاتی ارادہ و اختیار کا ایک ذرہ پاکر سرکشی و بغاوت پر آمادہ ہے، اسلام کی نماز انہی سرکش اور باغی انسانوں کو دوسری مطیع ذرہ بنا

مخلوقات کی طرح اُن حرکات و انقیاد و بندگی و سرافگندگی کی دعوت دیتی ہی، جب دنیا کی تمام
مخلوقات اپنی اپنی طرز اور اپنی اپنی بولیوں میں خدا کی حمد و ثنا اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں تو انسان
کیوں نہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ گا کر اپنی اطاعت کا ثبوت پیش کرے، اور یہی نماز ہے،

نماز کی روحانی غرض و غایت

نماز کی روحانی غرض و غایت یہ ہی کہ اس خالقِ کُل، رازقِ عالم، مالک
منعمِ عظیم کی بے نہایت بخششوں اور بے پایاں احسانوں کا شکر ہم اپنے دل اور زبان سے ادا
کریں، تاکہ نفس اور روح اور دل و دماغ پر اس کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و بیچارگی کا نقش
بیٹھ جائے، اُس محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے، اُس کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور
ناقابلِ زوال یقین کی صورت میں اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ و نیت اور
ہر جسمانی فعل و عمل کے وقت اُس کی ہشیار اور بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اُٹھی ہوئی دیکھیں جس سے
ہم اپنے بُرے ارادوں پر شرمائیں، اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے جھجکیں اور بالآخر اُن سے بالکل باز آ جائیں
صحیحین کی کتاب الایمان میں ہی کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے،
ایک شخص نے سائل کی صورت میں آکر نماز کی حقیقت دریافت کی، آپ نے اس کی تشریح فرمائی، پھر پوچھا
کہ یا رسول اللہ احسان کیا ہی؟ فرمایا کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو
دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہی، اسی طرح ایک اور شخص
کو نماز کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ نماز کی حالت میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے، کیونکہ اس وقت وہ
اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز کی باتوں میں مصروف ہوتا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

سنن نسائی کتاب الصلوٰۃ باب البزاق فی الصلوٰۃ و مسلم باب المساجد، مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۳ و جلد ۳ صفحہ ۱۷۶ و ۱۸۸ وغیرہ

کہ ایک رات جب آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے، اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے، تو آپ نے سرِ مبارک باہر نکال کر فرمایا، لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے، تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، اس کو جاننا چاہیئے کہ وہ کیا عرض معروض کر رہا ہے، نماز میں ایک دوسرے کی آواز کو مت دباؤ۔ ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں، اور اس کے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے اسی لئے قرآن پاک میں اس نکتہ کی شرح اس طرح کی گئی ہے

وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ ۖ إِنَّ الصَّلٰوةَ — اور نماز کھڑی کیا کر، کہ نماز بےحیائی

تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ — برائی کی باتوں سے روکتی ہے، اور البتہ

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ (عنکبوت ۵) — خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے،

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور بےحیائیوں سے روکتی ہے، اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے، اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں، بےحیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے، یعنی اس باطنی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے جس کا حصول انسان کی منزلِ مقصود اور حقیقی کامیابی ہے چنانچہ فرمایا،

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ — کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی

رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ (اعلیٰ)

۱؎ مسند احمد جلد ۲ ص ۳۶ و ص ۶۷ و ص ۱۲۹،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے، اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے:

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ	تم انہی کو ہوشیار کر سکتے ہو جو بن
رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ	دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں،
وَمَنْ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفْسِہٖ	نماز کھڑی کیا کرتے ہیں اور جو تزکیہ
وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ	دل کی صفائی حاصل کرتا ہے، وہ اپنے
(فاطر-۳)	ہی لئے حاصل کرتا ہے، اور آخر خدا
	ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے،

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اُس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی نفسانی برائیوں مٹاتی اور اُس کی روحانی قوتوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے، فرمایا:-

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا	بے شک انسان بے صبرا بنا ہے:
اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا	اس پر مصیبت آئے تو گھبرا آیا، اور جب
مَسَّہُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ	کوئی دولت ملے تو بخیل لیکن وہ نمازی
الَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَآئِمُوْنَ	(ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز
(مَعَارِج-۱)	ہمیشہ ادا کرتے ہیں

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والوں کو قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے:

نماز کے ان ہی ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک تمثیل میں صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف شفاف نہر بہتی ہو، جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو، تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ، ارشاد ہوا کہ نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل کو[1]

ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آکر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی، تب یہ آیت نازل ہوئی،[2]

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ	اور دن کے دونوں کناروں پر اور
وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ	رات کے کچھ حصوں میں نماز کھڑی کیا
یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ذٰلِکَ	کرو، بے شک نیکیاں برائیوں کو
ذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ،	دور کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے یاد رکھنے
(ہود - ۱۰)	والوں کو،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ مذہب اسلام اپنے پیروؤں میں جس قسم کے جذبات و خیالات پیدا کرنا چاہتا ہے، ان کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے، جو اپنے صحیح آداب و شرائط کے ساتھ بجا لائی گئی ہو، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا، جس کے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے،

۱؎ یہ حدیث مختلف کتابوں میں مختلف روایتوں کے ساتھ آئی ہے، کنز العمال (جلد ۴ ص ۷۶ و ۲۸) میں حاکم، احمد، ابن خزیمہ، طبرانی، اور بیہقی کے حوالوں سے یہ تمام روایتیں مذکور ہیں،

۲؎ صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ و تفسیر سورۂ ہود،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِكُمْ ۝ (نساء-۵)

پس تم اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یاد کرو۔

اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے صحابہ کرام کی یہی حالت تھی خدا نے اُن کی مدح فرمائی۔

اَلَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ (آل عمران-۲۰)

جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں۔

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی اُن کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے۔ فرمایا:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۝ (نور-۵)

یہ لوگ ہیں جن کو تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔

نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے۔

دوسری عبادت وہ ہے جو خاص شکل و صورت کے ساتھ مخصوص اوقات میں اور خاص دعاؤں کے ذریعہ سے ادا کی جاتی ہے اس کا نام نماز ہے۔ پہلی طرز عبادت انفرادی حیثیت ہے اور وہ ہر فرد کے جداگانہ انتخاب پر منحصر ہے، اس کو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے، ورنہ اسلام میں اُس کو جماعت کیساتھ ادا کرنا مسنون بتایا گیا ہے، وہ تنہائی کی نماز ہے جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہئے کہ ریا و نمائش کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو سکے، لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے، اس لئے اس کو جماعت کیساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے اور اس کے انکار پر قتل تک جائز ہو سکتا ہے، اگر اس کو جماعت کیساتھ کوئی

ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائے گی لیکن جماعت کے ثواب و برکات سے اس شخص کو محرومی
رہے گی، دوسرے لفظوں میں ہم اس کو یوں تعبیر کرسکتے ہیں، کہ عام ذکر و فکر اور تسبیح و تہلیل
انفرادی طریقۂ عبادت ہے، اور نماز ایک جماعتی شعار ہے، جو خاص ارکان و شرائط کے
ساتھ اوقاتِ مقررہ پر ادا ہوتی ہے، وہ جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت میں جس کے ادا کرنے کا حکم ہے، البتہ
اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کے ساتھ ادا نہ ہوسکے تو تنہا بھی اس کو ادا کرنا ضروری ہے، اس کی مثال اس
سپاہی کی سی ہے جو کسی منزل میں اپنی فوج سے جس کے ساتھ اس کو چلنا تھا کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا،
تب تنہا رہ کر بھی اس کو وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا،

نماز میں نظم و وحدت کا اصول

اسلام کے عام فرائض و احکام اور خصوصاً نماز اور اس کے متعلقات کی
نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے،
وہ یہ ہے کہ درحقیقت اسلام کا اصلی راز، بلکہ میرا ادعا ہے، اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہی ہے اور وہ توحید
یہ توحید نہ صرف ایک فلسفہ، نہ ذہنی شگافی اور نہ محض نکتہ پروری ہے، بلکہ وہ عملی کیفیت ہے، جس کو اسلام
کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہیے، اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت
کا آئینہ اور مظہر ہے، نماز کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش، ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارہ اور
ایک ایک ادا سے اس حقیقت و کیفیت کو ظاہر کرنا چاہیے، اور یہی سبب ہے کہ جب تک نماز کو
کوئی خاص شکل و صورت، آئین و طریق، اور سمت و وقت مقرر نہ کیا جاتا، جماعتیں اس کو ایک متحدہ
نظام میں ادا نہیں کرسکتی تھیں، اور نہ لاکھوں کروڑوں مسلمانوں پر جنہوں نے دعوتِ محمدی کو قبول
کیا فرض تھی، اب اگر ان میں سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی، کہ جیسے چاہے جب چاہے، جدھر

آ گیا ہے کہ جب طرح نماز کی دعائیں انسانی طرزِ بیان میں ادا کی گئی ہیں، اس کے ارکان بھی
انسان کے فطری افعال و حرکات کی صورت میں رکھے گئے ہیں،

انسان کے قلبی خیال و اعمال کے مظہر اس کے جسمانی اعضا ہیں کوئی شخص کسی دوسرے
شخص کے ارادہ و نیت اور اس کے دلی جذبات و احساسات کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں
کہہ سکتا جب تک اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے اُن کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر ہو،
اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان اپنی نسبت [illegible] خیر کل ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے اور سوسائٹی
کا کوئی فرد اس کی تکذیب نہیں کرسکتا لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے
سے متزلزل ہو جاتی ہے، اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے جس طرح
باہر کی، اور اس کے لئے کسی ظاہری عمل کی ضرورت نہیں، مگر خود بندوں کو ان کی ضرورت ہے
کہ وہ ظاہری و باطنی دونوں حیثیتوں سے عجز و نیاز اور تذلل و عاجزی کی تصویر بن جائیں،

انسان اپنے جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے خدا کا مخلوق ہے اس کی زندگی کے دونوں
جزو اس کے احسانات و انعامات سے یکساں گرانبار ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس خالق و
رازق اور اس رحمٰن و رحیم کے سامنے روح اور جسم دونوں ہم آہنگ ہو کر سجدۂ نیاز ادا کریں، غرض یہ وجوہ
تھے جن کی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونوں کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کئے،

یہ لکھا جا چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال و حرکات کے قالب میں نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے
جسمانی حیثیت سے ہم کسی بڑے محسن کی تعظیم اور اس کے سامنے عجز و عاجزی کا اظہار تین طریقوں
سے کرتے ہیں، کھڑے ہو جاتے ہیں، جھک جاتے ہیں یا زمین پر سر رکھ دیتے ہیں نماز کے بھی یہی تین

رکن ہیں، چنانچہ آغاز عالم سے انبیائے کرام علیہم السلام نے جس نماز کی تعلیم نسلوں کو دی وہ ان

تین اجزاء سے مرکب تھی، کھڑے ہونا (قیام) جھکنا (رکوع)، اور زمین پر سر رکھ دینا (سجدہ)،

ارکان نماز معلوم ہو چکا ہے کہ نماز ملت ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، حضرت ابراہیم و

جب خدا کے گھر کی تعمیر و تطہیر کا حکم ہوا تھا، اس کی غرض بھی بتا دی گئی،

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَ	اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں
الْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ	کھڑے ہونے والوں، رکوع کرنے والوں
(حج - ۴)	اور سجدہ کرنے والوں کیلئے پاک صاف رکھ

اس حکم میں نماز کے تینوں ارکان، قیام، رکوع اور سجود کا مفصل و بہ ترتیب ذکر ہے،

حضرت مریم کا زمانہ سلسلہ اسرائیلی کا آخری عہد تھا، ان کو خطاب ہوا،

يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي	اے مریم اپنے رب کے حضور میں کھڑے
وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ،	ہو کر بندگی کر اور سجدہ کر اور رکوع
(آل عمران - ۵)	کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر،

اس نماز میں بھی نماز کے تینوں ارکان موجود ہیں،

ان ارکان کی ترتیب جب کوئی حقیقت تین مرتب ارکان سے مرکب ہو، اور ان میں سے ایک

اول ہو اور دوسرے کا سب سے مؤخر ہونا ثابت ہو جائے تو تیسرے کا وسط میں ہونا خود بخود ثابت

ہو جائیگا، چنانچہ نماز کی ہر رکعت قیام، رکوع اور سجود سے مرکب ہے، اور قیام کا اول اور سجود کا آخر ہونا

قرآن پاک کی حسب ذیل آیت سے ثابت ہے تو رکوع کا ان دونوں کے بیچ میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا

"تب ابرام (ابراہیم) منہ کے بل گرا، اور خدا اس سے ہم کلام ہو کر بولا" (پیدائش ۱۷-۳)

"تب ابرام (ابراہیم) نے اپنے نوجوانوں سے کہا کہ تم یہاں گدھے کے پاس ٹھہرو، میں اس لڑکے کے ساتھ (اپنے فرزند کی قربانی کے لئے) وہاں تک جاؤں گا اور سجدہ کر کے پھر تمہارے پاس آؤں گا۔" (پیدائش ۲۲-۵)

"تب اس مرد (حضرت اسحاق کا مجی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند ابرہام کا خدا مبارک ہے۔" (پیدائش ۲۴-۲۶)

"اور ایسا ہوا کہ جب داؤد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا جہاں اس نے خدا کو سجدہ کیا۔"

(۲ سموایل ۱۵-۳۲)

زبور میں حضرت داؤد خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں:-

"اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا۔" (زبور ۵-۷)

ان حوالوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت میں سب دستور اور تعلیم انہی کے یہ تینوں ارکان موجود تھے، اور اسلام نے اس کی پیروی کی ہے۔ موجودہ انجیل میں دعا و نماز کا ذکر متی ۶ و ۵ و ۱۷-۲ و ۲۶-۳۶ مرقس ۱۴-۳۲ و لوقا ۲۲-۴۱ وغیرہ میں ہے۔ طریقہ نماز یہ ہے کہ انجیل میں ایک ہی موقع کے لئے گھٹنا ٹیکنا (جو گویا رکوع ہے) لوقا (۲۲-۴۱) اور دوسری (متی ۲۶-۳۹) منہ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے، اور بقیہ انجیلوں میں خاموشی ہے۔

عہد بعثت میں یہود و نصاریٰ میں جو لوگ نماز کے پابند تھے وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے، کھڑے ہو کر توراۃ یا زبور کی آیتیں تلاوت کرتے تھے اور سجدہ بھی کرتے تھے۔ قرآن پاک کی شہادت ہے

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ	وہ برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں کچھ
اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ	ایسے بھی ہیں جو رات کو خدا کی آیتیں
اٰنَآءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ	کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں، اور سجدے
(آل عمران - ۱۲)	کرتے ہیں:-

روایات میں ہے کہ مکہ میں یہودیوں کی طرح دونوں ہاتھ چھوڑے نماز میں، تھا
معلوم ہوا کہ عرب کے یہود بھی نماز کے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے،
اسلام کی نماز میں ان ہی قدیم ارکان اور ظاہری شکل و صورت کے ساتھ فرض ہوئی
جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے اب تک چلی آرہی تھی، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے
مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"اسلامی نماز ہی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے"
اسلام نے صرف یہ کیا کہ اس نماز کو وقف عام کر دیا، ان آمیزشوں کو نکال کر جو
ہوئے فرضیوں کو دوبارہ زندہ کیا، مٹے ہوئے نقش کو ابھار دیا، نماز کے بے جان پیکر میں حقیقت
کی روح پھونک دی، اس میں اخلاص کا جوہر پیدا کیا، اس کو دین کا ستون بنایا، اور اپنی
متواتر تعلیم و عمل سے اس کی ظاہری شکل و صورت کو بھی ہر انسانی تغیر سے محفوظ کر دیا، اس
طرح اس نے اس تکمیل کا فرض انجام دیا، جس کے لئے وہ ازل سے منتخب تھا۔

یہ مسئلہ کہ نماز محض تسبیح و تہلیل اور ذکر الٰہی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ ارکان بھی تھے

ے فتح الباری ابن حجر جلد ۲ صفحہ ۲۲۶۔ سے انسائیکلوپیڈیا مضمون صلوٰۃ، ا ج ۴ ص ۹۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے عمل متواتر کے علاوہ خود قرآن پاک سے بھی ثابت ہے۔ خوف اور جنگ میں نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے بعد ہے کہ جب خطرہ جاتا رہے تو نماز کو اس طرح ادا کرو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے۔

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ	نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی نگہداشت
الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ	کرو، اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے
فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا	ہو، پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار
فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا	ہو کر (پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے
عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ	تو اللہ کو ویسے یاد کرو جیسے اس نے
(بقرہ - ۳۱)	تم کو بتایا جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ذکر الٰہی کا کوئی خاص طریقہ تھا، جس کی عملی شکل نماز تھی۔ اس کی تفصیل سورۂ نساء میں ہے، اسی طرح جنگ کی نماز میں ایک رکعت [illegible] ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت کے متعلق کہا گیا ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا	پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو تو
اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ	اللہ کو اٹھتے بیٹھتے اور پہلو کے بل
فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ	یاد کرو، پھر جب اطمینان ہو جائے
(نساء - ۱۵)	تو نماز کھڑی کرو۔

۱؎ اس کی تشریح میں فقہا کا اختلاف ہے، میں نے یہاں وہ معنی لئے جو میرے نزدیک صحیح تھے

ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ میں مؤدب کھڑے ہوتے ہیں

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَوٰةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ (بقرہ-٣١)

نمازوں کی (عموماً) اور بیچ کی نماز پر (خصوصاً) نگاہ رکھو، اور خدا کے آگے مؤدب کھڑے ہو،

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہیں کہ

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ (اعلیٰ-١)

اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی،

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (مدثر-١)

اور اپنے رب کی بڑائی کر،

نعرہ اللہ اکبر جس کی نماز میں بار بار تکرار کی جاتی ہے، اسی حکم کی تعمیل ہے، اس کے بعد خدا کی حمد و ثنا کرتے اور اس سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں،

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ (طور-٢)

اور جب تو کھڑا ہو، تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔

پھر قرآن پڑھتے ہیں،

فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ (مزمل) قرآن میں سے جتنا ہو سکے پڑھو،

قرآن کی ان آیتوں میں خدا کے اسما اور صفات کا تذکرہ کرتے ہیں، اور اس کی حمد خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں جس سے اس کی بڑائی اور کبریائی ظاہر ہوتی ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ

کہہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، جو کہہ کر پکارو، سب اچھے نام اسی کے ہیں

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ	اپنی نماز نہ بہت زور سے پڑھو اور نہ بہت
بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا	چپکے بیچ کی راہ اختیار کرو اور کہو کہ
وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ	حمد اس اللہ کی جس نے کوئی بیٹا نہیں
وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي	بنایا اور نہ سلطنت میں کوئی اس کا
الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ	شریک ہے اور نہ درماندگی کے سبب
الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا ٥	اس کا کوئی مددگار ہے اور اس
(بنی اسرائیل - ۲)	کی بڑائی کر بڑی بڑائی ۔

چونکہ اس کی حمد سورۂ فاتحہ میں بہ تمام و کمال مذکور ہے اسی لئے اس سورہ کو نماز میں ہم پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن میں سے جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے اس کو پڑھتے ہیں، پھر خدا کے سامنے ادب سے جھک جاتے ہیں یعنی رکوع کرتے ہیں۔

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (بقرہ)	اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو

پھر اس کے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے ہیں یعنی سجدہ کرتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا	اے ایمان والو جھکو (رکوع کرو)
وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ	اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی
وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ	پرستش کرو اور نیک کام کرو تا
(حج - ۱۰)	کامیاب ہو۔

ان دونوں (رکوع و سجدہ) میں خدا کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں۔

سرنگوں کرنے کا حکم ہے، مختلف دعاؤں کے پڑھنے کی تاکید ہے، خدا کی تسبیح وتحمید کا حکم ہے
دعا اور استغفار کی تعلیم ہے، دل کے خضوع وخشوع کا فرمان ہے، رسول پر درود بھیجنے کا فرمان ہے
اس لئے نماز کی شکل اس طرح کی گئی کہ تنہا ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی
اور روحانی عبادتوں کے احکام یکجا ہوگئے، اسی لئے نماز قرآن کے تمام گوناگوں جسمانی
لسانی اور روحانی عبادات کا مجموعہ ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں، کہ قرآن
پاک میں مسلمانوں کو قیام، رکوع، سجود، تہلیل، تسبیح، تکبیر، قرأت قرآن، ذکر الٰہی، اور دعا پڑھنے کے
جو احکام عطا کئے گئے ہیں، ان کی مجموعی تعمیل کا نام نماز ہے، جس میں یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت
اختیار کر جاتے ہیں، دوسری طرف ان احکام کی بجا آوری میں ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے، اگر وہ نہ ہوتی
اور یہ کام انسانوں کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا کہ جب چاہے رکوع کرے، جو چاہے تو وہ کرے
جو چاہے تو قیام کرے، جو چاہے زبان ہی سے ذکر وقرأت پر قناعت کرلے، اور جو چاہے صرف
دل سے دھیان کرکے اس فرض سے ادا ہو جائے، تو ہر فرد سے فرائض الٰہی کے متعدد ارکان ادا ہو
جاتے ہیں جن پر کبھی عمل نہ ہوتا، اور سب نہیں کر دیتے ہیں تو اصل نماز ان پوشیدہ
احکام کی تعمیل ہے، نیز ان سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانوں کی عبادت میں وحدت ونظم وتشکل
پیدا نہ ہوتی، نہ جماعت ہو سکتی، ورنہ نماز کی ایک سب کی عبادت ادا کیا جا سکتا، اور نہ
نہ جماعتی رمز وشعار کی وحدت کی شان اس سے پیدا ہوکر مسلمانوں کو وحدت بنا دیتی،
اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ اپنے رسول کو اس عبادت کی عملی تعلیم دی، اور رسول نے

سلہ موطا امام مالک وصحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ۔

اُمت کو سکھایا، اور اُمت نے نسلاً بعد نسلٍ موجودہ اور آیندہ نسل کو سکھایا، اس پورے تواترِ عمل کے ساتھ جس میں ذرا بھی شک شبہہ نہیں وہ آج تک محفوظ ہے۔

نماز کی دعا

نماز کی مختلف حالتوں میں ان حالتوں کے مطابق دعائیں پڑھی جاتی ہیں یا پڑھی جا سکتی ہیں، خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نماز کی مختلف حالتوں کی بیسیوں مختلف دعائیں مروی ہیں، اور ہر مسلمان اُن میں سے جو چاہے، پڑھ سکتا ہے لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے جس کے نماز میں پڑھنے کی تاکید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے جس کو آپ نے تمام عمر نماز کی ہر رکعت میں پڑھا اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہیں، وہ سورۂ فاتحہ ہے جو مقاصد نماز کے ہر پہلو پر حاوی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ سب میں نماز کی اصلی دعا ہے جو خدا نے بندوں کی بولی میں اپنے منہ سے ادا کی

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ	حمد اُس اللہ کی جو سب جہان
اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ	کا پروردگار ہے، رحم والا مہربان ہے
الدِّيْنِ ۙ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ	ہمارے عمل کے بدلے کے دن کا مالک
نَسْتَعِيْنُ ۙ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ	(ہے) (اے آقا) ہم تجھی کو پوجتے ہیں
الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ	اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں، تو ہم کو
اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ	سیدھا راستہ چلا، اُن کا راستہ جن پر تو نے
عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۠	فضل کیا، اُن کا راستہ نہیں جن پر
(فاتحہ - ۱)	غضب آیا، اور نہ اُن کا جو بہک گئے

(اس دعا کو ختم کرکے آمین کہتے ہیں یعنی اے خدا، تو اس کو قبول کر)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان، ہر نماز میں دہراتا ہے جس کے بغیر ہر نماز ناتمام اور ادھوری رہتی ہے[1] یہ دعا اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے، خدا کی حمد و ستائش ہے توحید ہے اعمال کی جزا و سزا کا یقین ہے، عبادت کے مخلصانہ ادا کا اقرار ہے، توفیق و ہدایت کی طلب ہے اچھوں کی تقلید کی آرزو اور بُروں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے، جس وقت اس حمد میں خدا کی پہلی صفت کل جہانوں کا پروردگار زبان پر آتی ہے، تو اس کی تمام قدرتیں اور بخششیں جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں، سب سامنے آجاتی ہیں، جہانوں کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت و کبریائی کی وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے، سارے جہانوں کے ایک ہی پروردگار کے تصور سے کل کائنات ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے، انسان ہوں کہ حیوان چرند ہوں کہ پرند پھر انسانوں میں امیر ہوں یا غریب مخدوم ہوں یا خادم بادشاہ ہوں یا گدا، کالے ہوں یا گورے عرب ہوں یا عجم، کل مخلوقات خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکساں معلوم ہوتی ہیں خدا کو رحمان و رحیم کہہ کر پکارنے سے اس کی بے انتہا رحمت بے پایاں شفقت غیر محدود بخشش، اور ناقابل بیان کیفیت محبت کا سمندر دل کے کوزہ میں موجیں مارنے لگتا ہے اور روز جزا کے مالک کا خیال ہم کو اپنے عمل کی ذمہ داری، اور خود سے باخبر اور خدا کے سامنے جوابدہی سے مرعوب کر دیتا ہے، ہم تجھی کو پوجتے ہیں، کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں، تجھی سے مدد مانگتے ہیں، بول کر ہم تمام دنیوی سہاروں اور بھروسوں کو ناچیز سمجھتے اور

[1] جامع ترمذی، قرأت فاتحہ۔

صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈتے، اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیازمند بن جاتے ہیں، سب سے آخر ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں، یہ سیدھی راہ (صراط مستقیم) کیا ہے؟ اس کی شریعت کے احکام ہیں،

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ
عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ج وَ
لَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ
إِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ
إِيَّاهُمْ ج وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ج وَلَا
تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ
إِلَّا بِالْحَقِّ ط ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ وَلَا تَقْرَبُوا
مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ
حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ج وَأَوْفُوا
الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ج لَا
نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ج

کہہ دے (اے پیغمبر) آؤ میں تم کو پڑھ کر
سناؤں، جو تمہارے رب نے تم پر حرام
کیا ہے، یہ کہ اُس کے ساتھ شریک نہ
کرو، ماں باپ کیساتھ نیکی کرو،
غربت کے سبب اپنی اولاد کو قتل مت
کرو، ہم تم کو اور اُن کو روزی دیتے ہیں،
بےحیائی کی باتوں کے نزدیک نہ جاؤ خواہ
وہ ظاہر میں فحش ہوں یا باطن میں، اور
جس جان کو خدا نے محترم کیا ہے، اس کو
مت مارو، لیکن انصاف کے ساتھ،
یہ باتیں ہیں جن کا حکم خدا نے تم کو
دیا ہے، شاید کہ تم سمجھو، اور یتیم کے مال
کے پاس مت جاؤ، لیکن اچھی نیت سے،
یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے،

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ	اور ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ
ذَا قُرْبَىٰ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا	پورا رکھو، ہم کسی کو اس کی طاقت
ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ	سے زیادہ کا حکم نہیں دیتے، جب
تَذَكَّرُونَ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي	تم بات بولو تو انصاف کی، گو وہ
مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ج،	تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو، اور
(انعام-۱۹)	خدا کے عہد کو پورا کرو، یہ وہ باتیں
	ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت

پکڑو، اور یہ کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے تو اسی پر چلو۔

اس آیت نے واضح کر دیا کہ دینِ محمدی کی اصطلاح میں صراطِ مستقیم کیا ہے، یعنی شرک نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا، معصوم اور بے گناہ جانوں کی عزت کرنا، ناحق قتل نہ کرنا، یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول میں ایمانداری، ہر حال میں سچ بولنا، اور عہد کو پورا کرنا، یہ وہ صفاتِ عالیہ ہیں جن کو صراطِ مستقیم کی مختصر سی ترکیبِ توصیفی میں ہم خدا سے روز مانگتے ہیں جو خلق کا جوہر اور نیکی کی روح ہیں۔ یہی وہ صفاتِ حسنہ ہیں جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے جن پر اس کا فضل و انعام ہوا، یہ خاص بندے کون ہیں؟ قرآن پاک نے اس کی تشریح بھی خود کر دی ہے۔

وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ	اور جو خدا اور رسول کے حکم پر چلتے ہیں
فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ	تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن
اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ	پر خدا کا فضل اور انعام ہوا یعنی

تو خدا فرماتا ہے "میرے بندے نے میری ستایش کی" پھر جب وہ الرحمٰن الرحیم (مہربان
نہایت رحم والا) کہتا ہے، تو خدا فرماتا ہے "میرے بندے نے میری تعریف کی" پھر وہ کہتا ہے مالک
یوم الدین (نیک و بد کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے "میرے بندے نے میری
بزرگی ظاہر کی" یہ میرا حصہ ہے اور میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک
یہ ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ "ہم تجھی کو پوجتے ہیں، اور تجھی سے مدد چاہتے
ہیں" اور اس کے بعد آخر تک (کہ ہم کو سیدھا راستہ دکھا) میرے بندہ کی دعا ہے اور میرے بندہ نے
جو مانگا وہ اس کو ملا"[۱]

اس حدیث قدسی کے مطابق جب نمازی نماز میں اس دنیا کو جو دلکش و دلفریب نظر آتی ہے
ذہن سے نکال دیتا اور دل میں حضور پیدا کرتا ہے تو یہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور ایک عیسائی
پروٹسٹنٹ فلسفی سیٹ ویمینک (Geo. Grenninck) کو بھی ہوا تھا جس نے انسائیکلوپیڈیا آف
سوشل سائنس میں نماز پر ایک پر معلومات مضمون لکھا ہے تھوڑی دیر کے لئے خاک آخر تک لکھتا جاتا ہے وہ لکھتا ہے

"(اس وقت کی روح) نماز حضور قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہئے، ایک دفعہ محمدؐ نے ایک پر نقش
قبا کو پہنے کو اس سے اتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بٹتی ہے اور یہ کہ نماز صرف
ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں بلکہ اس میں دلی خشوع و خضوع کی بھی ضرورت
ہے اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے جس میں محمدؐ نے کہا کہ مجھے تمہاری دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں
خوشبو اور عورت اور میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز ہے" محمدؐ پر نماز میں گریہ زاری ہو جاتا تھی بعض اوقات

[۱] جامع ترمذی تفسیر سورۂ فاتحہ و مسند ابن حنبل جلد ۲ ص ۲۰۰ (مصر)

منقول ہیں۔ نماز کی ایک سب سے اہم خصوصیت وہ ہے جس کو بعض حدیثوں میں بتایا ہے

جن میں بیان ہے کہ "نماز خدا سے سرگوشی و مناجات ہے" اور اس کی تشریح ایک حدیث

قدسی میں ہے کہ "سورۂ الحمد میرے اور میرے بندہ کے درمیان بٹی ہوئی ہے"[۱]

اس دعائے محمدی کا موازنہ دوسرے انبیاء کی منقول دعاؤں سے

دنیا میں کوئی پیغمبر نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو، اور نماز میں پڑھنے کے لیے کوئی دعا تعلیم نہ کی گئی ہو، گو وہ پوری طرح محفوظ ہو کر باقی نہ رہ گئی ہو۔ حضرت موسیٰؑ نے نماز میں جو دعا پڑھی تھی، وہ توراۃ کی کتاب خروج میں ہے۔ حضرت داؤدؑ کی زبور تو شروع سے آخر تک دعاؤں کا مجموعہ ہی ہے، مگر اس میں کسی خاص دعا پر یہ عنوان نہیں کہ یہ نماز داؤد کی نماز ہے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ اپنی وہ دعا شب میں حواریوں کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہیں، جو آج تک عیسائیوں کی نماز کا اصلی جزو ہے۔ ان دعاؤں کو سامنے رکھ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیری کیفیت، حسن تعبیر، جامعیت، پاکیزگی اور اختصار کا اندازہ کرو تو پتہ چلے گا کہ اس کی کیا بے مثالی ہے، جس کے سبب سے نمازوں میں پڑھنے کے لیے یہی کا انتخاب ہوا، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت اُبیؓ سے فرمایا تھا کہ "نماز میں جو سورہ پڑھی جاتی ہے یعنی ام القرآن، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ توراۃ میں اتری، نہ انجیل میں، نہ زبور میں، اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز خود قرآن میں موجود ہے۔" اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے ہوگا۔

---

[۱] یہ حدیث دیگر کتب کے علاوہ جامع ترمذی، فضائل سورۂ فاتحہ۔

حضرت موسیٰ کی نماز کی دعا

توراۃ کی کتاب خروج میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ توراۃ لینے اور ربانی تجلی دیکھنے کیلئے کوہ طور پر چڑھے۔ اور تجلی نظر آئی تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدہ میں گر پڑے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دعا تعلیم کی۔

"خداوند، خداوند، خدائے رحیم اور مہربان قہر میں دھیما، اور رحمت و وفا میں غنی، ہزاروں پشتوں کے لئے فضل رکھنے والا گناہ اور تقصیر اور خطا کا بخشنے والا لیکن وہ مجرم کو ہرگز معاف نہ کرے گا بلکہ باپ دادوں کے گناہوں کی ان کے فرزندوں سے اور فرزندوں کے فرزندوں سے تیسری اور چوتھی پشت تک سزا دیتا ہے۔"

اس دعا کے ابتدائی فقرے اگرچہ نہایت موثر ہیں لیکن خاتمہ نہایت مایوس کن ہے پہلے فضل و رحمت کی امید دلا کر آخر میں سب اجابت پر قفل چڑھا دیا ہے۔

زبور میں حضرت داؤد کی نماز کی دعا

زبور باب ۸۶

داؤد کی نماز

"اے خداوند! اپنا کان جھکا اور میری سن کہ میں پریشان اور مسکین ہوں میری جان کی حفاظت کر کہ میں دیندار ہوں اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جس کا توکل تجھ پر ہے رہائی دے اے خداوند مجھ پر رحم کر کہ میں تمام دن تیرے آگے نالہ کرتا ہوں اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کہ اے خداوند میں اپنا دل تیری طرف اٹھاتا ہوں کیونکہ تو اے خداوند بھلا اور بخشنے والا ہے اور تیری رحمت ان سب پر جو تجھ کو پکارتے ہیں وافر ہے"

"اے خداوند! میری دعا سن اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر۔"

مصیبت کے دن تجھ کو پکاروں گا کہ تو میری سنے گا معبودوں کے درمیان اے خداوند
تجھ سا کوئی نہیں، اور تیری صنعتیں کہیں نہیں۔ اے خداوند ساری قومیں جنہیں تو نے
خلق کیا آئیں گی، اور تیرے آگے سجدہ کریں گی، اور تیرے نام کی بزرگی کریں گی۔
تو بزرگ ہے، اور عجائب کام کرتا ہے تو ہی اکیلا خدا ہے۔

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ بتا، میں تیری سچائی میں چلوں گا میرے دل کو یک رخ
کر تا کہ میں تیرے نام سے ڈروں۔ اے خداوند! میرے خدا میں اپنے سارے دل
سے تیری ستایش کروں گا، اور ابد تک تیرے نام کی بزرگی کروں گا کہ تیری رحمت
مجھ پر بہت ہے، اور تو نے میری روح کو اسفل پاتال سے نجات دی ہے۔

"اے خدا مغروروں نے مجھ پر چڑھائی کی، اور تند خو لوگوں کی جماعت میری جان کے
پیچھے پڑی ہے، اور انہوں نے مجھ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں رکھا۔ لیکن تو اے خداوند
خدای رحیم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے، اور شفقت اور وفا میں بڑھ کر۔ میری طرف
توجہ ہو اور مجھ پر رحم کر، اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش، اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو بچا
دے۔ مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا، تا کہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہیں، دیکھیں اور شرمندہ
ہوں کیونکہ تو نے اے خداوند! میری مدد کی، اور مجھے تسلی دی۔

اس دعا میں بھی خدا کی حمد، وصف اور توحید و عبادت کا ذکر راہ راست کی
ہدایت کی طلب اور شریروں اور مغروروں سے بچائے جانے کی درخواست ہے لیکن طول
تکرار اور دعا مانگنے والے کی شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ ہر شخص کی دعا نہیں

خدا کی تمام صفات کاملہ کا مرقع ہے، تمام مقاصد اور احکامِ شریعت کی جامع ہے، اُس کے الفاظ میں
ایسی عالمگیری ہے، جو ہر وقت اور ہر حالت میں ہر انسان کے دل کی نمایندگی کر سکتی ہے اور
ایسے استعارات سے پاک ہے، جو ناواقفوں کی لغزش کا باعث ہوں، ورنہ خدا کو [illegible]
رحم و کرم کی صفت قرض لینے پر آمادہ کرتے ہوں، نیز وہ خدا کی رحمتِ عام کو ایسے عنوان سے
ادا کرتی ہے جس میں کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے، خدا کی وہ تین صفتیں جن کا تصور
کے بغیر خدا کا تصور پورا نہیں ہو سکتا، یعنی ربوبیت، رحمت، اور مالکیت، یہ سورہ ان سب
کی جامع ہے، ربوبیت میں وہ تمام صفتیں داخل ہیں، جن کا تعلق پیدایش سے لے کر موت
تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے، رحمت اس کی وہ عالمگیر صفت ہے جس میں اس کی تمام جمالی
صفتوں کی نیرنگیاں ظاہر ہوتی ہیں، مالکیت اُس کی تمام جلالی صفتوں کا مظہر ہے، اور پوری
سورہ دو امر کے، غرض ثنا و حمد، اچھائیوں کے لئے درخواست، اور برائیوں سے بچنے کی التجا
پر مشتمل ہے، طرزِ بیان خدا، اور بندہ کے شایانِ شان ہے، اور جو صفتیں مذکور ہوئی ہیں اوصاف بھی
وہی ہیں، جو ایک دعا کے مناسب ہو سکتے ہیں، دعا میں عموم ہے، وہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے
للہیت اور روحانیت کا کمال منتہائے نظر ہے، اس لئے دنیاوی چیزوں کا ذکر نظرانداز کیا گیا ہے
خدا کے اوصاف اور بندہ کی التجا میں کیفیت دونوں حیثیتوں سے مناسب ہے، یعنی
دونوں حصوں نے مناسبت کیسی توجہ گیری ہے، اور دونوں ٹکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق
قائم ہے، خدا کے عظمت و جلال، رحم و کرم، قدرت و شوکت، شفقت و رافت اور بندہ کے خشوع
و خضوع، بندگی، صداقت طلبی کا ایسا جامع اختصار، اور پُر اثر بیان سورہ فاتحہ کے سوا

کہاں مل سکتا ہے،

نماز کے لئے تعیین وقت کی ضرورت

نماز کے سلسلہ میں اسلام کا ایک اور تکمیلی کارنامہ اوقاتِ نماز کی تعیین ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا، اس لئے کسی کام کے کرنے کے لئے وقت سے بے نیازی ممکن نہیں۔ اب سوال یہ ہو کہ کیا نماز کے لئے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کامل کو لے کر مبعوث ہوئے، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے محض نظری نہیں، اس لئے نماز کی تعلیم دی تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے۔ انسان کی نفسیات کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مدت کے ساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے جب تک وہ اس کے لئے وقت مقرر نہ کرلے تب بھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ باقاعدہ انجام نہیں دے سکتا، اسی لئے ضرور ہے کہ باقاعدہ نماز کی تکمیل کے لئے وقت کی تعیین ضروری ہو، دنیا میں ہر قسم کا مذہب نے اپنے باقاعدہ اور منظم کاموں کے لئے منتخب کیا ہے۔ اس میں اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہو کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لئے ہم گھنٹوں کی مہلت ہے، تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے، یہاں تک کہ دن تمام ہو جاتا ہے اور آخری گھڑی بھی گذر جاتی ہے اور وہ اس کام کو انجام نہیں دیتا، لیکن جب کاموں کیلئے اوقات متعین ہو جاتے ہیں تو ہر مقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے اور وہ وقت گذرنے نہیں پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آجاتا ہے، اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو یاد دلاتا رہتا ہے وہ

تمام کام پابندی کے ساتھ بلا ناغہ انجام پاتے جاتے ہیں،

اوقاتِ نماز کے تقرر میں وہ چیز بھی مدنظر ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی حصولِ وحدت جو اسلام کا اصلی طرۂ شعار ہے، مسلمان مختلف شہروں اور ملکوں اور قصبوں میں ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں، مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت وحدت کا مرقع بن جاتی ہے، کرۂ ہوائی پر لگی ہوئی دوربین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ایک ہی وضع میں ایک ہی شکل میں خالق عالم کے سامنے سرنگوں پاؤ گے! اور جہاں تک مطلع و مغرب میں نمایاں فرق نہ ہوگا یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہیگا، مختلف ملکوں میں طلوع و غروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہیں ہونے دیتا، تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس وقت جس حالت میں ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے جب دوسری جگہ بھی اسی حالت میں ہوتا ہے، تو نماز کا فرض اس وقت ادا ہوتا ہے، یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحۂ زمین تو کجا ایک محلہ اور ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت میں نظر نہیں آسکتے تھے۔

نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں

اسی لئے اوقات کے تقرر اور تعین کی اسی مصلحت کو دنیا کے تمام مذہبوں نے یکساں تسلیم کیا ہے، اور اپنے اپنے نظریوں اور اصولوں کے مطابق عبادتوں کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے ہیں، ہندو آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت پوجا پاٹ کرتے ہیں، زردشتی صرف طلوعِ آفتاب کے وقت زمزمہ خواں ہوتے ہیں، رومن کیتھولک عیسائی صبح کو طلوعِ آفتاب سے پہلے پھر شام کو پھر رات کو سوتے وقت نماز مانگتے ہیں، یہودیوں میں تین

یونانی میں تیسرے پہر کے بجائے نویں گھڑی کو لکھا ہے جس کو ہم عصر کہتے ہیں۔ اسی

اسی وقت کی نماز کا ذکر اعمال ۱۰ - ۳۰ میں بھی ہے۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی آپ نے بتائی اور

فرمایا کہ دعا کا بہترین وقت آدھی رات ہے۔

اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا جب مانگ چکا ایک نے اس کے شاگردوں

میں سے اس سے کہا کہ اے خداوند ہم کو دعا مانگنا سکھا۔ جیسے کہ یوحنا حضرت یحییٰؑ

نے اپنے شاگردوں کو سکھایا۔ اس نے ان سے کہا جب تم دعا مانگو تو کہو ...... اس نے

ان سے کہا تم میں سے کون ہے جس کا ایک دوست ہو اور وہ آدھی رات کو اس

کے پاس آکے کہے اے دوست مجھے تین روٹیاں ادھار دے۔ (لوقا ۱۱)

انجیل میں حضرت عیسیٰؑ نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے چنانچہ جس شب کو انہیں

گرفتار کیا گیا وہ ایک جماعت کے ساتھ اسی نماز تہجد میں مصروف تھے (لوقا ۲۲ - ۳۹)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل میں موجود ہے مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت میں ہے اور

بڑے تڑکے پو پھٹنے سے پہلے وہ اٹھ کے نکلا اور ایک ویران جگہ میں گیا اور وہاں دعا مانگی

عربی ترجمہ سے جو براہ راست یونانی سے ہوا ہے[1] یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام روزانہ

اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے چنانچہ متن میں اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے وفی الصبح باکرا

قام وخرج الی موضع خلاء وکان یصلی هناک یعنی وہ وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔

---

[1] مطبوعہ لندن ۱۸۲۵ء مطبوعہ مطبع ادبیہ بیروت ۱۸۹۹ء ومطبع آکسفورڈ ۱۸۶۰ء

اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی مقدس کتابوں میں مذکور ہیں ہم جمع کرلیں تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہو جائیں گے جن میں سے صبح (فجر) دوپہر (ظہر) اور شام (مغرب) کا ذکر زبور (۵۵-۱۶ و ۱۷) میں، صبح کا مرقس (۱-۳۵) میں، عصر کا اعمال (۳-۱ و ۱۰-۳ و ۹ و ۳۰) میں ہے، اور عشاء رات کی نماز کا لوقا (۱۱ و ۲۲-۳۹) میں۔

نماز کے مناسب فطری اوقات

اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح شب و روز عمر دعا و نماز میں مصروف رہتا، مگر انسان کی فطری و نوعی ضرورتوں کے سبب سے ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا، اس لئے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لئے چند مناسب اوقات مقرر کردیئے۔ ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ حصے گذارا کرتا ہے۔ صبح کو وہ بیدار ہوتا ہے، دوپہر تک کام کرکے تھوڑی دیر سستاتا اور پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ روزانہ کام ختم کردیتا ہے اور اس کو تمام کرکے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل میں داخل ہوتا ہے، شام ہوتی ہے تو پھر گذری ہوئی زندگی کا اندازہ کرتا ہے، اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اسلامی نماز کے اوقات پر یک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی میں محسوب ہوں۔ نور ظہور کے وقت جب صبح کا نسیم سحری تک بھی الصلوٰۃ کا نغمہ جانفزا سناتی ہے، اور ہر شے کی زبان تو عالم کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے تو یہ وقت غافل انسانوں کے سر جھکانے کیلئے بھی نہایت موزون ہے کہ انسان کی زندگی میں حیات امروزہ کا ایک نیا ورق جس وقت کھلتا ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس دن کے

کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدۂ نیاز کا طغرا نقش ہو، اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت
کا آغاز کرتا ہی اور دوپہر تک اس میں مصروف رہتا ہی، دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف
حصہ ختم کر کے آدمی تھوڑی دیر کے لئے آرام کرتا ہے، اس موقع پر تب اس کو خدا کا شکر ادا
کرنا چاہئے کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہو گیا، پھر سہ پہر کے بعد جب انسان اپنا کام ختم
کر کے سیر و تفریح اور ذاتی آرام کے کام کو شروع کرنے لگتا ہی تو یہ وقت بھی بہت فرحت کا دم
لینے کا ہی، اس کے بعد شام ہوتی ہی، جو دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہی، دن بھر کے
کاموں کے بعد اب آرام و سکون کا دور شروع ہوتا ہی، اس لئے ضروری کہ اس وقت کی نماز بھی عبودیت
کا سجدہ ہو، پھر سوتے وقت جب انسان اپنی احساس زندگی ہی کچھ دیر کے لئے بے خبر ہونے
لگتا ہے، تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لیکر اس جہان سے بے خبر ہو، کیونکہ کیا معلوم کہ اس وقت
کی ان بند ہونے والی آنکھوں کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہو گا، اسی طرح آخر عمر تک روزانہ
کام کے یہ پہیے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں،

صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہیں، اسی لئے صبح سے زوال
تک کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی، اسی طرح عشاء سے لیکر صبح تک کوئی فرض نماز نہیں ہے
کہ یہ وقت صرف خواب راحت کے لئے موزوں ہے، ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات
تمام تر انسان کے کام کے ہیں، ان ہی کام کے اوقات کے شروع میں نماز پنجگانہ مقرر ہوئی ہے

موسمی وقت نماز میں ایک نکتہ

اوقات نماز کی تعیین میں اسلام کے لئے ایک اور اصول کو بھی پیش نظر
رکھنا ضروری تھا، دنیا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ پڑھنے سے معلوم

ہوتا ہے کہ انسانوں کے شرک کا سب سے بڑا مظہر جسدِ کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ (آفتاب) ہے
ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان، ہر جگہ سورج کی پرستش کی جاتی تھی
جس کی پرستش قلوبِ انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی۔ آفتاب پرست قوموں میں
آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات مقرر تھے، جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جاہ و جلال کے
ساتھ نمودار ہوتا ہے، پھر جب وہ آہستہ آہستہ مملکتِ نیمروز کو فتح کر کے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط
کا اعلان کرتا ہے، پھر شام کو جب وہ عالمِ کائنات سے رخصت ہو کر نقابِ شب میں اپنا چہرہ چھپاتا ہے
سب سے پہلا موحد جس نے آفتاب پرستی کا چراغ گل کیا[۱] حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم تھے، ملتِ ابراہیمی میں نماز کے وہ اوقات مقرر کیے گئے، جب ستارہ پرستوں کے خدا
(آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہیں، بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے تاکہ
یہ اوقات خود زبانِ حال سے شہادت دیں کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اس
خدائے برحق کی عبادت ہے جس کے آستانۂ کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے
دینِ محمدی ملتِ ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اس لیے اس میں بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے
جو ملتِ ابراہیمی میں تھے، دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پردۂ عدم میں
روپوش ہوتا ہے، دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر انحطاط و تنزل کی طرف جھکتا ہے
اس انحطاط و تنزل کے بعد بھی تین دور ہوتے ہیں، جب (سمت الراس) سے نیچے اترتا ہے
جس کو زوال کہتے ہیں، جب آنکھوں کے دائرۂ مقابل سے نیچے اترتا ہے جس کو عصر کہتے ہیں، اور

[۱] قرآن پاک سورۂ انعام - ۹ -

پھر جب دائرۂ نصف النہار سے نیچے گرتا ہے جس کو مغرب کہتے ہیں، آفتاب نظروں سے غائب ہوتا ہے، ان
لحاظ میں ایک ایک نماز ادا ہوتی ہے۔ غروب یعنی حرارت ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی تہ میں
ہوجاتا ہے۔ اس وقت عشا کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں نماز کے اوقات کے
ذکر میں آفتاب کے ڈھلنے اور تاریکی چھانے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ	نماز کھڑی کر آفتاب ڈھلنے کے وقت
اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ	رات کی تاریکی تک (ظہر، عصر، مغرب
(اسرائیل ۔ ۹)	عشاء) اور فجر کی نماز

(تفصیل آگے آتی ہے)

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام نے کوئی فرض نماز آفتاب کے دوپہر کو نہیں رکھی، کیونکہ یہ آفتاب
کے عروج کا وقت ہے، بلکہ تمام نمازیں آفتاب کے ہر تدریجی انحطاط و تنزل اور دوپہر کے بعد کے
وقت میں ہیں، نیز یہی سبب ہے کہ اسلام میں آفتاب نکلتے وقت اس کے عروج و کمال کے وقت
اور اس کے ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے کہ یہ آفتاب پرستوں کی عبادت
کے خاص اوقات ہیں۔[1]

اسلام میں موقتی اوقات نماز نماز کس طرح اور کن کن وقتوں میں ادا کی جائے، کتنی رکعتیں پڑھی
جائیں، اور اس کے کیا کیا آداب و شرائط ہیں، ان سب کے لئے قرآن پاک میں بجز اس آیت کے
جو لڑائی کی حالت میں نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ میں مذکور ہے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا۔

حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ (بقرہ ۳۱) — نمازوں کی نگرانی رکھو،

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ، (معارج-۱) — اور جو اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں،

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۔ (مومنین-۱) — اور جو لوگ اپنی نمازوں کی نگرانی رکھتے ہیں،

وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (انعام-۱۱) — اور وہ اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں،

ایک آیت میں یہ بھی فرمایا:-

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ (معارج-۱) — جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں،

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتا اور اس کو ہمیشہ پابندی کیساتھ وقت پر اور اس کی ساری شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہئے،

نماز کے اوقات مقرر ہیں اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے ہیں، ارشاد ہے:-

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (نساء ۱۵) — بے شبہہ نماز مسلمانوں پر مقررہ وقت میں فرض ہے،

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ہماری فرض نمازوں کے لئے اوقات مخصوص ہیں،

وہ اوقات کیا ہیں ادائے نماز کے لئے قرآن نے زیادہ تر تین لفظ استعمال کئے ہیں صلوٰۃ یا اقامت صلوٰۃ، تسبیح اور ذکر اللہ، پہلا لفظ اقامتِ صلوٰۃ نماز کیلئے مخصوص ہی، لیکن دوسرے

تیسرا لفظ قرآن میں تسبیح و تحمید ہے، جو یاد الٰہی اور نماز کے لئے بولا جاتا ہے، جس کا ذکر جزو اعظم تسبیح و تحمید ہے، احادیث میں بھی تسبیح کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں،[1] اور اشعار عرب[2] و لغت عرب[3] سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ قرآن میں جب اس لفظ تسبیح کے ساتھ وقت کی تخصیص ہوگی، تو اس سے کسی شبہ کے بغیر نماز کے سوا کوئی اور چیز مراد نہیں ہو سکتی، کیونکہ وقت مخصوص کیساتھ اسلام میں نماز کے سوا کوئی عام تسبیح فرض نہیں ہے، البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہاں تسبیح کا حکم دیا ہو، تو حق خدا کی یاد و توصیف مراد ہو سکتی ہے

اس تمہید کے بعد حسب ذیل آیتوں پر غور کرنی چاہئے،

۱۔ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا (مزمل)	۱۔ رات کو کھڑا رہا کر، مگر کچھ کم، یا آدھی رات یا اس سے کچھ گھٹا دے یا بڑھا دے اور قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ،
۲۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ (المؤمن ۶۰)	۲۔ اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ سہ پہر اور صبح کو کر

[1] صحیح بخاری باب صلوۃ الضحیٰ، ما رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی سبحۃ الضحیٰ قط وانی [illegible]

وسبح علی حین العشیات والضحی ۔ ولا تحمد الشیطان واللہ فاحمدا
(شعر [illegible] جلد ۳ ص ۲۶۵)

[3] لسان العرب جلد ۳، ص ۳۰۱، مصر،

٣- وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا
(احزاب-٦)

٣- اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو۔

٤- وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا
(فتح-١)

٤- اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو۔

٥- وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ
تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ
مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ
وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (اعراف)

٥- اور تو اپنے پروردگار کو اپنے
دل میں گڑگڑا کر، اور ڈر کر، اور پست آواز
میں [illegible] اور سہ پہر کو یاد کر اور بے خبر
والوں میں سے نہ ہو۔

٦- وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ
(انعام-١)

٦- اور (اے رسول) اُن کو مت نکال
جو اپنے پروردگار کو صبح کو اور سہ پہر کو
پکارتے ہیں۔

٧- فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ
تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ
لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ رِجَالٌ
(نور-٥)

٧- ان گھروں میں جن کے بلند کرنے کا
حکم خدا نے دیا ہے۔ اور اس کا کہ ان
میں خدا کا نام لیا جائے اور اُن میں
وہ لوگ جن کو دنیا کا کاروبار خدا سے
غافل نہیں کرتا، صبح اور سہ پہر کو خدا

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ

٨- اور تو (اے رسول) اپنے کو ان لوگوں

يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ ؛ (کہف - ۴)

کے ساتھ رہ، جو اپنے پروردگار کو صبح اور سہ پہر کے وقت پکارتے ہیں

۹- وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ؛ (طور - ۲)

۹- اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی بیان کر جب تو اٹھتا ہے، اور رات کے حصہ میں اس کی تسبیح کر، اور ستاروں کے پیچھے ہٹنے کے وقت،

۱۰- وَأَقِمِ الصَّلَوٰةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِنَ اللَّيْلِ (ہود - ۱۰)

۱۰- اور نماز کو قائم کر دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں

۱۱- أَقِمِ الصَّلَوٰةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ ؛ (اسرائیل - ۹)

۱۱- اور نماز کو قائم کر آفتاب کے ڈھلنے کے وقت رات کی ابتدائی تاریکی تک، اور فجر کا پڑھنا، بیشک فجر کا پڑھنا حضور ہے اور رات کو کچھ دیر جاگ کر زائد نماز پڑھ، (تہجد)

۱۲- وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا (دہر ۲)

۱۲- اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر صبح کو، سہ پہر کو، اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور بڑی رات تک تسبیح کر،

۱۳- فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَ

۱۳- کافروں کے کہے پر صبر، اور اپنے

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰی (طٰہٰ ۸)

پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ حصوں میں اس کی تسبیح پڑھ اور ان کے کناروں میں تاکہ تو

۱۴- فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ، وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ، (روم-۲)

۱۴- تو خدا کی تسبیح پڑھو، جب شام کرو اور جب صبح کرو، اور اسی کی حمد آسمانوں اور زمین میں، اور سہ پہر کو اور جب تم دوپہر کرو،

۱۵- فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ، وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (ق ۳)

۱۵- تو ان کافروں کے کہے پر صبر کر، اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے، اور ڈوبنے سے پہلے، اور کچھ رات میں تسبیح پڑھ اور ڈوبتے [2]

۱۶- مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ (نور ۸)

۱۶- فجر کی نماز سے پہلے، اور جب دوپہر کی گرمی سے جب کپڑے اتارتے ہو، اور عشاء کی نماز کے بعد،

ان اوپر کی آیتوں میں مختلف اوقات کا ذکر ہے ان میں سے بعض مقرر ہیں اور بعض نہیں

[2] جمہور کے نزدیک اس کا ترجمہ ہوگا سجدوں کے بعد اور عام اہل تفسیر نے اس سے فرض نمازوں کے بعد کی تسبیح و تہلیل مراد لی ہے

مکرر اوقات کو ملا دینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے۔ اور آپ کے بعد آپ کے صحابہؓ اور اُس وقت سے لیکر آج تک تمام روئے زمین کے مسلمان نسلاً بعد نسلٍ ادا کرتے آئے ہیں۔ اور جن کے مشہور نام فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء ہیں۔ غدو، غداۃ، بکرۃ، فجر، قبل طلوع الشمس، اور حین تصبحون کے معنی صبح کی نماز، حین عشی، اور قبل غروب شمس سے مراد عصر، دلوک شمس (زوال)، اور حین تظہرون (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر، طرف النہار (دن کا کنارہ)، اور تمسون (جب شام کرو) سے مراد مغرب، اور من اناء اللیل (کچھ رات گذرے)، غسق اللیل (رات کی ابتدائی تاریکی) اور صلوۃ عشاء سے مقصود عشاء کی نماز ہے۔ اور یہی نماز کے پانچ اوقات ہیں جن میں خدا کی یاد اور تسبیح و تحمید کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔

نماز کا یہ طریقہ تقریباً تین برسوں تک رہا، جب اسلام کی دعوت مخفی نہیں رکھی جا سکتی تھی کیونکہ جناب وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ، (شعراء -) اپنے قریب کے خاندان کو ہشیار کرو، کے ذریعہ سے دعوت کے اعلان کا حکم آیا تب وہیں اسی کے بعد مذکور ہے،

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۔ اور غالب مہربان پر بھروسہ رکھیے

الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ وَ ۔ جو تجھ کو اس وقت دیکھتا ہے جب

تَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ إِنَّهُ ۔ تو نماز کے لئے اٹھتا ہے اور نمازیوں

هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۔ میں تیرا پھرنا دیکھتا ہے، بیشک وہی

(شعراء - ۱۱) ۔ سنتا اور جانتا ہے،

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلان دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ان ابتدائی زمانہ کے بیچ میں راتوں کو اٹھ کر خود نماز پڑھتے تھے اور مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز میں مصروف ہے اور کون سویا ہوا ہے جس کو نماز کے لئے جگانا چاہیے، ایسی پرخطر حالت میں ان راتوں میں تن تنہا یہ فرض انجام دینے کے لئے اللہ تعالیٰ پر اعتماد ہی تھا کہ خدا آپ کو خود دیکھ رہا ہے اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے، اس کے بعد جب نسبتاً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم آگے کی طرف بڑھا اور رات کی طویل نماز تہجد کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشاء) اور تاروں کے چھپتے وقت بھی ایک نماز (فجر) اضافہ کی گئی،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ ۔ اور اپنے رب کے فیصلہ کا منتظر رہ کیونکہ بیشک

بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۔ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے،

حِیْنَ تَقُوْمُ ○ وَمِنَ الَّیْلِ	اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر جب تو
فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ○	نماز کو کھڑا ہو اور کچھ رات کے حصہ میں اسکی
(طور - ۲)	تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت

یہ آیت سورۂ طور کے آخر میں ہے، اور سورۂ طور کے متعلق ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی[1]، اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا، کیونکہ اس سورہ میں اسی آیت سے پہلے آپ کے مصائب اور ان پر صبر کرنے اور فیصلۂ الٰہی کے انتظار کا حکم اور آپ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق ہے، سورۂ دہر میں جو جمہور کے نزدیک مکی ہے، اور غالباً سورۂ طور کے بعد اتری، ان ہی معنوں کی ایک اور آیت ہے جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہتے، اور بڑھتی ہے،

فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ وَلَا تُطِعْ	تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر
مِنْهُمْ آثِمًا اَوْ کَفُوْرًا ○ وَاذْکُرِ اسْمَ	اور ان مخالفوں میں سے کسی گنہگار
رَبِّکَ بُکْرَةً وَّاَصِیْلًا ○ وَمِنَ	یا اللہ کے ناشکر گزار کا کہنا نہ مان
الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَیْلًا	اور صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار
طَوِیْلًا ○	کا نام لیا کر، اور کچھ رات گئے اس کو
(دہر - ۲)	سجدہ کر، اور رات کو دیر تک اس کی تسبیح کر

[1] صحیح بخاری تفسیر طور، روایت جبیر بن مطعم،

ب رات کی دیر تک کی نماز تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے یعنی صبح، آخر دن، اور ابتدائی شب۔ اگرچہ اصیل[1] میں ظہر و عصر اور من اللیل رات میں مغرب و عشا کی تفریق نہیں ہوئی تھی لیکن کل تین نمازیں تھیں، ایک فجر کے وقت، ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو، اسی لئے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھنے کا حکم تھا، کہ آیت بالا سے ظاہر ہے،

اب یہ تین وقتوں کی تسبیح و تحمید باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہے، حکم ہوتا ہے:

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ — دن کے دونوں کناروں میں یعنی فجر اور
زُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ (هود-..) — عصر اور رات کے کچھ حصے میں نماز پڑھا کر

یہ آیت سورۂ ہود کی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے، اس میں کثرت انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ بیان کرکے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت کو خدائے برحق کی عبادت کی دعوت دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے اور غالباً نماز کے اوقات کے سلسلے میں یہی آیت ہے جس میں تسبیح کے بجائے باقاعدہ صلوٰۃ کی اقامت کا حکم آیا ہے، اس وقت مسلمانوں کی خاص تعداد تھی، جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے،

---

[1] اصیل دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں، عام کتب لغت میں لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہو اس کو اصیل کہتے ہیں، لسان العرب میں اصیل کے معنی عشی کے ہیں جو عصر کا پیمودہ دوم میں مستعمل ہو، وقت دوپہر کو بھی کہتے ہیں، قرآن مجید میں دو جگہ ہے قبل طلوع الشمس وقبل غروبها اور العشی والابکار، بالغدو والآصال میں پہلا لفظ فجر بکرۃ اور غدو ہے دوسرا عصر عشی اور اصیل ہے

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ	پس تو سیدھا چل جیسا کہ تجھ کو حکم
تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ،	دیا گیا ہے ، اور وہ جنھوں نے تیرے
(ھود - ۱۰)	ساتھ توبہ کی ، وہ بھی سیدھے چلیں ،
	اور تم لوگ حد سے آگے نہ بڑھو ،

اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازیں باقاعدہ فرض ہوتی ہیں ، ایک دن کے ایک کنارہ میں یعنی رات کے خاتمہ کے قریب تاروں کے چھپنے کے وقت ، دوسری دن کے دوسرے کنارے میں دن کے خاتمہ کے قریب ، اور تیسری رات کے ابتدائی حصہ میں ، پہلی سے صبح کی نماز ، دوسری سے عصر کی جس کو پہلے اصیل کہا گیا تھا ، اور تیسری سے عشاء کی نماز مراد ہے ، ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجمال اور ابہام تھا ، دوسری میں ظہر و عصر اور تیسری میں مغرب و عشا کی نمازیں چھپی ہوئی تھیں ، اب رات کی نمازیں سب سے پہلے علیحدہ ہوتی ہیں ، سورہ ق جو مکی سورہ ہے اللہ تعالیٰ اپنے قدرت خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے ،

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ	پس ان (مخالفوں) کے کہنے پر (اے
بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ	رسول) صبر کر ، اور آفتاب کے نکلنے سے
وَقَبْلَ الْغُرُوبِ وَمِنَ اللَّيْلِ	پہلے (صبح) اور اس کے ڈوبنے سے پہلے (عصر)
فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ ،	اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح کر ، اور رات
(ق - ۳)	گئے پر (عشاء) اس کی تسبیح کر ، اور
	(آفتاب) کے سجدہ کرنے کے بعد (غروب)

کی عملی مثالیں اس نکتۂ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں،

اوقاتِ پنجگانہ اور آیتِ اسراء

محدثین اور مورخین کا اتفاقِ عام ہے کہ نماز کے اوقاتِ پنجگانہ کی تعیین معراج میں ہوئی ہے، جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارہویں سال ذی الحجہ سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی، گو اوقاتِ پنجگانہ کا ذکر سورۂ ق و روم میں موجود ہے، جو معراج سے پہلے نازل ہو چکی تھیں لیکن اقامتِ صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورۂ اسراء (معراج) میں نماز پنجگانہ کا حکم ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ کی تکمیل بصورتِ صلوٰۃ یعنی معراج میں ہوئی، جس طرح وضو پر عمل گو پہلے سے تھا مگر اس کا حکم قرآن میں مدنی سورتوں کے اندر نازل ہوا ہے، سورۂ اسراء (معراج) کی وہ آیت جس میں نماز پنجگانہ کا ذکر ہے، حسب ذیل ہے،

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ	آفتاب کے جھکاؤ کے وقت سے رات کی اندھیری
إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ	تک نماز کھڑی کر، اور فجر کی قرأت بھی کر
إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا (اسراء-۹)	بیشک فجر کی قرأت میں حضور ہوتا ہے،

یہ آیتِ کریمہ اوقاتِ پنجگانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے، اس میں سب سے اہم تشریح کے قابل لفظ "دلوک" ہے، دلوک کے اصلی معنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں، لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ "دلوک الشمس" یعنی آفتاب کے جھکنے سے کیا مراد ہے؟ اور اہلِ عرب اس کو کن معنوں میں بولتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ عربی میں اس لفظ کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے، زوال[1] یعنی مقابل[2] نقطۂ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر، اور غروب[3]، اور جب آیتِ مذکورہ میں یہ کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) پر نماز کھڑی کرو تو ان تینوں اوقات

یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم آتی، غرض یہ ہے کہ اوجِ کمال پر پہونچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے، تو اُس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں، ایک نقطہ سمت الراس سے دوسرا نقطہ تقابل سے اور تیسرا دائرہ افق سے، پہلا ظہر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا، اور تیسرا مغرب کا، اور اس کے ہر دلوک یعنی انحطاط پر اُس کی خدائی کی نفی کی و تردید اور خدائے برحق کی الوہیت کے اقرار و اعلان کے لئے ایک ایک نماز رکھی گئی ہے، اس طرح "دلوک" کے لفظ کے اندر تین نمازوں کے وقت آ گئے ہیں، چوتھی نماز کا وقت "غسقِ لیل" (رات کی تاریکی) ہے، یہ عشاء کی نماز ہے، اور اس کو حقیقت میں نصف شب کو ادا ہونا چاہئے جب آفتاب کا چہرۂ نورانی تو بر تو حجاباتِ ظلمت میں چھپ جاتا ہے، لیکن لوگوں کی تکلیف کے خیال سے وہ سونے سے پہلے رکھی گئی تاکہ خواب کی غفلت کی تلافی اس سے ہو جائے، اور پانچویں نماز کا وقت "قرآن الفجر" (صبح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے، یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لئے ادا کی جاتی ہے، کہ عنقریب وہ ظاہر ہو کر اپنے پرستاروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا، اس لئے ضرور ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالقِ اکبر کا نام لے، اور اس باطل پرستی سے جتا دے کہ آفتاب پرست، عنقریب جمع ہونے والے ہیں تیری ظاہر کر دی، غرض اس آیتِ پاک سے اقامتِ صلوٰۃ کے اوقاتِ پنجگانہ کا ثبوت ملتا ہے، اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلامِ عرب میں آفتاب کے ان تینوں جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے، اگر کلامِ عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقاتِ پنجگانہ کی تشریح کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا،

دلوک کی تحقیق مفسرین میں سے بعض نے "دلوک" سے زوال کا وقت اور بعض نے غروب کا وقت

يعني الشمس قال ابو منصور
قد روينا عن ابن مسعود انه
قال دلوك الشمس غروبها
روى ابن هانئ عن الاخفش انه
قال دلوك الشمس من زوالها
الى غروبها وقال الزجاج دلوك
الشمس زوالها في وقت الظهر
وذالك ميلها للغروب وهو
دلوكها ايضا يقال دلكت براح
اي قد مالت للزوال حتى كاد
الناظر يحتاج اذا تبصرها ان
يكسر شعاع عن بصره براحته

فان قيل
ما معنى الدلوك في كلام
العرب قيل الدلوك الزوال

ابو منصور نے کہا کہ ہم نے ابن مسعود سے
روایت کی ہے کہ دلوک شمس آفتاب غروب
ہے اور ابن ہانی نے اخفش سے نقل کیا کہ
دلوک شمس زوال سے غروب تک ہے
اور زجاج نے کہا کہ دلوک شمس ظہر کے
وقت آفتاب کا زوال ہے اور اس
کے معنی غروب کیلئے جھکنا بھی ہیں اور یہ
بھی اس کا دلوک ہے محاورہ میں کہا جاتا
ہے کہ دلکت براح وبراح یعنی آفتاب
زوال کے لیے جھک گیا یہاں تک کہ
دیکھنے والا جب اس کو دیکھنا چاہے تو
اس کی کرن کی شدت کو توڑنے کیلئے
اس کو آنکھ پر ہتھیلی رکھنے کی ضرورت
ہو۔

تو اگر کہا جائے کہ
عرب کے محاورہ میں دلوک کیا معنی ہیں؟ تو
جواب دیا جائے گا کہ دلوک کے معنی زوال کے ہیں

عصر کا وقت ہوتا ہے۔ غرض دلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر بولا جاتا ہے۔ اس کا پہلا جھکاؤ
زوال کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے۔ دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے
جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے اور مغرب کی طرف چلتے وقت آنکھوں کے سامنے
پڑتا ہے۔ اس وقت شعاعوں کی تیزی سے بچنے کے لئے آدمی کو آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور
چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے جب وہ
سمت افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے۔ ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال
سے لے کر غروب تک نماز پنجگانہ میں منقسم ہیں۔ بعض اہل لغت نے جیسا کہ ازہری نے نقل کیا ہے دلوک کو
زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں، حالانکہ اس کا صحیح تحقیقی مفہوم آفتاب کے تین میلانات
پر کیا جاتا ہے۔ اوّل اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے۔ پھر اس میلان پر جو سمت نظر سے
ہوتا ہے۔ اور بعد ازاں اس میلان پر جو سمت افق سے ہوتا ہے۔ اور یہ اوقات زوال سے غروب تک
مسلسل یکے بعد دیگرے بتدریج گھنٹوں کے بعد آتے ہیں۔ اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ

اَقِمِ الصَّلوٰۃَ لِدُلُوکِ الشَّمسِ — آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر

سے مراد تین نمازیں ہیں کیونکہ تین دلوک ہوتے ہیں۔ ظہر جب آفتاب کا (دلوک) سمت الراس
سے ہوتا ہے، عصر جب اس کا دلوک سمت النظر سے ہوتا ہے اور مغرب جب اس کا دلوک
سمت افق سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد غسق اللیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی قرأت)
سے مراد عشاء اور فجر کی نمازیں مراد ہیں۔ اس طرح اس آیت پاک سے جو معراج میں نازل ہوئی پانچوں وقت

۱؎ تفسیر میں بھی صحابہ کی روایتوں سے تینوں نمازوں کا اختلاف روایت مروی ہے۔ مثلاً حضرت ابن مسعودؓ

اس میں قیاس، اور عقلیت کو دخل نہیں، اس بنا پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہیں، سب کے نزدیک مسلم ہے، کہ دن کے دو ہی ممتاز حصے ہیں، ایک صبح سے دوپہر تک اور دوسرا دوپہر سے شام تک، اطراف سے ان ہی دونوں حصوں کے آخری کنارے یہاں مراد ہیں، صبح سے دوپہر تک کے حصہ کا آخری کنارہ ظہر ہے، اور دوپہر سے غروب تک کے حصہ کا آخری کنارہ عصر یا مغرب ہے، لیکن چونکہ عصر کا ذکر قَبْلَ غُرُوْبِہَا کے اندر مستقل موجود ہے، اس لئے متعین ہو گیا کہ یہاں اس سے مراد مغرب ہے،

ایک دوسرا طریقہ ثبوت اگر ہم قرآن پاک کی علیحدہ علیحدہ آیتوں سے اوقاتِ پنجگانہ پر استدلال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، مثلاً

۱۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ — زوالِ آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر،

یہ ظہر کی نماز ہے،

۲۔ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (ق-۳) — اور غروب آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کر،

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا (دہر-۲) اور اپنے پروردگار کا نام صبح کو اور عصر[1] کو،

یہ عصر کی نماز ہوئی اور اسی کو وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی (بقرہ-۳۱) (بیچ کی نماز) سورۂ بقرہ میں اسی لئے کہا گیا ہے، کہ یہ دن کی نمازوں میں ظہر اور مغرب کے بیچ میں واقع ہے،

۳۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّہَارِ۔ (ہود-۱۰) — اور دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی) کناروں میں نماز کھڑی کر،

دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے،

---

[1] اصیل الوقت بعد العصر الی المغرب (صحاح جوہری و لسان العرب)

۴۔ سورۂ نور میں ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے بے پکارے زنانہ کمرہ یا مکان میں جا کر نہ

مِنْ قَبْلِ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ (نور ۸) صبح کی نماز سے پہلے

اس سے نمازِ صبح کا عملی ثبوت بھی ملا، پھر اسی میں اسی موقع پر ہے۔

۵۔ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوۃِ الْعِشَآءِ اور عشاء کی نماز کے بعد

اس کے رو سے مسلمانوں کو عشاء کی نماز کے بعد جو سونے اور کپڑے اتار دینے کا وقت ہے
کسی کے مکان میں بلا اجازت اندر جانے کا حکم نہیں، یہ بھی نمازِ عشاء کا عملی ثبوت ہے، اور یہی

پانچوں اوقاتِ نماز ہیں،

نماز حدیث و سنت میں

تمام انبیاء علیہم السلام میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو خاص تفوق و امتیاز حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لے کر آئے اس کی ہر بات
صرف نظری اور خیالی نہ تھی اور نہ وہ کسی حیثیت سے مبہم اور مجمل رہی، بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق
اس کی پوری تشریح فرما دی اور خود عمل فرما کر اپنے تمام پیروؤں سے اس کی تعمیل کروا کر اس کے متعلق
ہر قسم کے پیدا ہونے والے شک و شبہہ کی جڑ کاٹ دی، اسلام نے جس روزانہ طریقِ عبادت
کو پیش کیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان، آداب، شرائط، اوقات
و تعداد کی پوری پوری تشریح فرما دی، اور ان میں سے ہر چیز ناقابلِ شک قولی و عملی تواتر کے ذریعہ سے
ہم تک پہنچی، نماز کس طرح پڑھنی چاہئے، اس میں کیا کیا پڑھنا چاہئے، کن کن وقتوں میں پڑھنی چاہئے،
کس وقت کی نماز کی کے رکعتیں ہیں، ان میں تو ہر چیز کی آپ نے زبانی تشریح فرمائی، صحابہ کو معین
کی، دورۂ نبوت کی پوری زندگی میں جو حکمِ نماز کے بعد گذری ایک دن تو دن نہیں کم از کم مدینہ میں

کی نمازیں الگ الگ ہوئیں، تو ان کے بعد رات کی طویل نماز میں تخفیف ہوگئی، اور حکم آیا:
فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ یعنی قرآن سے اس قدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو،
اس کے بعد اس آیتِ پاک میں جب اقامتِ صلوٰۃ کے اوقاتِ پنجگانہ کا ذکر آیا تو رات کی نماز
کی تہجد کی فرضیت ساقط ہوگئی، یہاں تک قابلِ ذکر بات اور بھی ہے، اور وہ یہ کہ شاید یہ آیت
پاک اوقاتِ نماز کی تکمیل کی آخری علامت ہے، کیونکہ اس کے نازل ہونے سے پیشتر تک قدیم
فرض نماز تہجد نفل نہ تھی، اور اب نفل ہوگئی۔

قبلہ انسان کا کوئی کام جس طرح زمانے سے خالی نہیں ہوسکتا جس کی بنا پر اوقاتِ نماز
کی تعیین کی گئی ہے، اسی طرح مکان سے بھی خالی نہیں ہوسکتا، جب انسان کوئی کام کرے گا
تو ظاہر ہے کہ اس کا منہ کسی نہ کسی سمت ہوگا، اگر نماز میں کسی خاص سمت کا تعین نہ ہوتا، اور
یہ عام اجازت دیدی جاتی، کہ جس کا جدھر جی چاہے منہ کرکے نماز ادا کرے تو جماعت کی ہیئت
کا شیرازہ درہم برہم ہوجاتا، اور نمازیوں کی وحدتِ صوری قائم نہ رہتی، بلکہ اگر ایک ہی مسجد
میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب کوئی پچھم، کوئی اتر اور کوئی دکھن رخ کرکے کھڑا ہوتا تو یہ
وحدتِ نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ عجیب مضحکہ انگیز تماشا بن جاتا۔ اس لئے ہر مذہب
میں عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی سمت خاص کر لی گئی ہے۔ صابئی ستارہ پرست، قطب شمالی کی طرف
منہ کرتے تھے کہ ستاروں میں وہی ہے، جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا بلکہ برقرار
رہتا ہے۔ آفتاب پرست سورج کی طرف منہ کرتے ہیں۔ آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہیں اور بت پرست

---

۱ صحیح مسلم جلد اول باب [illegible]
۲ الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ،

جسے میں نے تیرے نام کے لئے بنایا ہے (۸-۴۴)

اسی صحیفہ میں آگے چل کر ہے:-

"اور اُس زمین کی طرف جو تو نے اُن کے باپ دادوں کو دی اور اس شہر کی طرف جسے
تو نے چُن لیا اور اُس گھر کی طرف جو میں نے تیرے نام کے لئے بنایا ہے تیری طرف دعا کریں" (۴۸)

اہل عرب میں کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی، جو بنی اسرائیل میں بیت المقدس کو
اس لئے اہل عرب کا قبلہ کعبہ تھا، اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا	اور ہر ایک اُمت کا ایک قبلہ ہے جدھر
فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ	وہ منہ پھیرتی ہے، تو اے مسلمانو!
(بقرہ - ۱۴۸)	نیکیوں کی طرف دوڑو

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ دنیا کے تین مذاہب میں تین قسم کے قبلے تھے، ستارہ پرست
یا ستارہ پرستی سے متاثر، پرستش کے لئے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ بناتے تھے، مثلاً آفتاب پرست
آفتاب کے طلوع کے رُخ یعنی مشرق کو اور صابی (ستارہ پرست) قطب شمالی کو، عنصر پرست
یا بت پرست اپنے پرستش کے عنصر یعنی آگ یا کسی دریا... یا کسی بت کو قبلہ قرار دیتے تھے
موحدین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے تھے۔

ابراہیمی قوموں میں اس قسم کی مرکزی مسجدیں دو تھیں، مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور
مسجد حرام (خانہ کعبہ) پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحاق اور اُن کی اولاد کے سپرد ہوئی تھی
اس لئے وہ اُن کا قبلہ تھی اور دوسری مسجد کے متولی حضرت اسمٰعیل اور ان کی اولاد تھی، اس لئے وہ ان کا قبلہ بنا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں رہے، خانہ کعبہ کی طرف اس طرح منھ کرکے کھڑے ہوتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے پڑجاتے تھے لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی کیونکہ بیت المقدس مدینہ سے شمال اور خانہ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا، تاہم چونکہ کعبہ کے قبلہ ہونے کی نسبت کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تھی، اس لئے آپ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے کہ وہی انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا لیکن آپ کی طبعی خواہش یہ تھی کہ اس زندہ ملت ابراہیمی کے لئے وہی پہلا مسجد (خانہ کعبہ) قبلہ قرار پائے جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیم) کی طرف سے حضرت اسمٰعیل کے سپرد ہوئی تھی، چنانچہ سورہ بقرہ کے وسط میں اس کے متعلق احکام نازل ہوئے، جن میں سب سے پہلے یہ بتایا کہ خدا کو کسی خاص جہت و سمت کوئی تعلق نہیں، کیونکہ وہ بے سمت ہے اور سب سمتیں اسی کی ہیں،

وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (بقرہ-۱۴۰)

اور اللہ ہی کے لئے پورب اور پچھم تو جدھر رخ کرو، ادھر ہی خدا کا منھ ہے، بےشک اللہ بڑی گنجائش اور وسعت والا اور بڑے علم والا ہے،

اس کی گنجائش اور وسعت میں ہر سمت داخل ہے اور ہر جہت کی اس کو خبر ہے، یہ آیت کریمہ قبلہ کے تعین کی ایسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے، تمام تر غلط قرار دیتی ہے، دوسری آیت میں بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے،

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ

بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان مسلمانوں

مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا
عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ
يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ (بقرہ - ۱۷)

کو ان کے اس قبلہ سے کس نے پھیر دیا،
جس پر وہ تھے، کہدو کہ پورب اور پچھم
دونوں خدا کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے
سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

یہود جن کو سب سے زیادہ اعتراض تھا کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر مغربی یعنی خانہ کعبہ کو کیوں قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کر کے فرمایا۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ
الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ
وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ
ابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ
وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ
فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ

نیکی یہی نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور
مغرب کی طرف پھیرو، البتہ نیکی یہ ہے کہ خدا
قیامت فرشتوں کتاب اور پیغمبروں
پر جو ایمان لائے اور اپنی دولت کو کسی
محبت کے باوجود (یا خدا کی محبت پر)
رشتہ داروں یتیموں غریبوں مسافروں
سائلوں اور غلاموں کو آزاد کرانے میں)
دے، اور نماز پڑھے، اور زکوٰۃ دے، اور
نیکی یہ ہے کہ جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں
اور سختی اور تکلیف، اور جنگ میں صبر
کرتے ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے ہوئے

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (بقرہ) — اور یہی پرہیزگار ہیں،

اس تصریح سے بخوبی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام میں قبلہ کی کیا حیثیت ہے، قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ جس کا رخ کیا جائے، فی نفسہ عبادت کے لئے کوئی ضروری چیز نہ تھی لیکن چونکہ اسلام میں امت کے نظام وحدت کو قائم رکھنے کے لیے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی، اسی لئے سنہ ۲ھ میں خانۂ کعبہ کے قبلہ بنانے کا حکم ہوا،

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (بقرہ ع ۱۷)	پس تو اپنا منہ مسجد حرام (خانۂ کعبہ) کی طرف پھیر، اور تم لوگ جہاں کہیں ہو اسی کی طرف اپنا منہ پھیرو،

اسلام نے قبلہ کے لئے کسی خاص سمت کو نہیں بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا جس کے چاروں طرف چاروں سمتوں سے نماز پڑھی جا سکے، اس طرح مشرق، مغرب، جنوب، شمال سب بیک وقت مسلمانان عالم کا قبلہ ہیں جس سے ایک فائدہ یہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے، اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعین سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً آفتاب، قطب شمالی وغیرہ) کو مسجودیت اور معبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا، اور جس سے بت پرستی اور ستارہ پرستی کا رواج ہو گیا تھا، اس کا کلیۃً خاتمہ ہو گیا،

لیکن یہ مرکزی مسجد بیت المقدس کے بجائے مسجد حرام (کعبہ) قرار دی گئی جس میں بہت سی مصلحتیں تھیں،

۱- یہ ضروری تھا کہ قبلہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص ہر جگہ سے، ہر وقت منہ پھیر سکے ایسی چیز یا تو کوئی مصنوعی شے ہو سکتی تھی، مثلاً کوئی چراغ، کوئی مومی شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسمہ، کوئی کتاب جیسا کہ اوپر گذر چکا بعض اہلِ مذاہب اُن چیزوں کو سامنے رکھتے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے، مثلاً بت، مجسمہ، آگ، پانی، آفتاب وغیرہ اشیاء و عناصر وکواکب، ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا، تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی میں گرفتار ہو جاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء کو نہیں، بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا، مثلاً شمال یا مشرق کی پہلی سمت میں نگاہ سے نہ ٹلنے والا قطب تھا، اور دوسری چہرۂ خورشید کا مطلع اور بیاضِ سحر کا دیباچہ تھی، دینِ توحید کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ ستارہ پرستی کے ابطال کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے مقامات امتیازات کو ترجیح دیا

۲- یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منہ کرنا ستارہ پرستی ہوتی، کسی اور سمت کا انتخاب کیا جا سکتا تھا، مگر یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ چار سمتوں میں کسی ایک کا انتخاب بھی نہ کسی مرجح سبب ہی کی بنا پر ہو سکتا تھا۔ نہ نظر کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی، اب جو بھی سمت اختیار کی جاتی اس کے لئے ضروری تھا کہ اس کی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بتائی ہوتی، سمت کی تعیین آفتاب یا دوسرے ممتاز ستاروں کے طلوع و غروب کا لحاظ کئے بغیر ممکن ہی نہیں، کیونکہ ہر سمت میں کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے جس کی سیدھ سے وہ سمت متعین کی گئی ہے، اس لئے جو سمت بھی اختیار کی جاتی، اس سے اس سمت کے خاص ستارہ کے متعلق وجہ ترجیح کا پیدا کرنا ضروری تھا، اور اس ترجیح سے دینِ توحید کا دینِ شرک بن جانا لازمی تھا،

۳- اسی لئے ملتِ ابراہیمی نے ان صورتوں کو چھوڑ کر خدا نے کسی قربانگاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ بنا

آتش پرستی کے ہر قسم کے نشانات سے اس کی نماز محفوظ رہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی مسجدوں میں سے ان کی نسل نے دو مرکزی مسجدوں کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جس کو حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے اپنے اپنے زمانوں میں بڑے اہتمام سے تیار کرایا، اور یہی اسرائیل کا قبلہ تھی، دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی۔

۴۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانۂ کعبہ بیت المقدس سے پہلے بنا تھا، وہ دنیا میں پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا، اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ تھے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ	بے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو
لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا	انسانوں کے لئے خدا کا بنا، وہ ہے
(آل عمران – ۱۰)	جو مکہ میں ہے،
وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ	اور جب کہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ بیت اللہ
مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ (بقرہ ۱۵)	کی بنیادیں اٹھاتے تھے،

خانۂ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار عہد اسلام کے یہود کو بھی نہ تھا، چنانچہ قرآن پاک میں ہے،

وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ	اور جن کو کتاب دی گئی، وہ جانتے
لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ	ہیں کہ خانۂ کعبہ کا قبلہ ہونا حق ہے
(البقرہ – ۱۷)	(اور وہ) ان کے پروردگار کی طرف سے ہے

پولوس (پال) ایک خط میں جو گلتیوں کے نام ہے، لکھتا ہے۔

کہ یہ لکھا ہے ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کے دو بیٹے تھے ایک لونڈی (ہاجرہ) سے دوسرا آزاد
(سارہ) سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا (اسمٰعیل) جسم کے طور پر پیدا ہوا، اور جو آزاد سے
تھا (اسحٰق)، سو وعدہ کے طور پر۔ یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ عورتیں
دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصری تھیں، اور سینا مصر کے راستہ میں تھا)
پر سے جو جواد دونوں غلام جنتی ہیں، یہ ہاجرہ ہے، کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور
اب کے یروشلم (بیت المقدس) کا جواب ہے، اور یہی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے
پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے۔ (گلتیوں کے نام ۲۲ - ۲۶ - باب ۴)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوگا کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بھید سے آگاہ تھا کہ یروشلم اور
بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں۔ اگلے یروشلم سے ظاہر ہوتا ہے
کہ یروشلم نیا ہے، اور بیت اللہ پرانا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد تھیں یعنی
اُن کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیمؑ سے خدا نے دو وعدے کئے تھے۔ ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر
ہوا تھا جب وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مصر سے آ رہی تھیں۔ اور راستہ میں سینا پڑتا تھا۔ اس
وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی اولاد نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا۔ اور یہ
خدا اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہو گئے۔ یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک اُن کے مرکزی
عبادتگاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا۔ سارہ کے وعدہ کا یہاں ذکر نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے
کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی۔ گویا حضور نور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشتر
خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا۔ چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت

مرد، سرکشی اور شرارت کے سبب سے اس عہد کو توڑ دیا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد خدا نے اُن کو متنبہ کیا جس کا ذکر سورۂ اسراء کی آیتوں میں ہے، اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا، تو خدا نے اُن سے اپنا عہد توڑ کر بنو اسمٰعیل کا وہ عہد شروع کیا، جو "سینا" پر حضرت ہاجرہؑ کے متعلق باندھا گیا تھا،

معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) میں نماز ادا کرنا، اور اس کے چند سال بعد خانہ کعبہ کا قبلہ بن جانا گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست اور بنو اسمٰعیل کے عہد کی ابتدا کا اعلان تھا، جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد میں سلسلۂ معراج،

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا	پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو رات کے
مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی	وقت مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے اس
الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ	مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا
بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ (بنی اسرائیل)	جس کے پیرامون ہم نے برکت دی ہے

کی تفسیر میں لکھا گیا ہے،

"اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس جو عہد اسرائیلی کا نشان تھا، اسلام کے بعد اس میں قبلہ ہونے کی شان باقی نہیں رہی، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی جس کا تعلق عہد اسمٰعیلی سے تھا، (یعنی خانہ کعبہ) وہ عہد کیا تھا، اس کی تفصیل یہ ہے:۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّہٗ	اور جب خدا نے چند باتوں میں ابراہیم
بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ قَالَ اِنِّیْ	کو آزمایا تو اس نے ان باتوں کو پورا کیا

جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۚ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۚ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۚ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ

(بقرہ ۱۵)

خدا نے کہا میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں، (ابراہیم نے) کہا، اور میری نسل میں سے (خدا نے) فرمایا، میرا عہد ظالموں کو شامل نہ ہوگا اور جب ہم نے گھر (کعبہ) کو لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ اور امن بنایا، اور تم ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں، رکوع کرنے، سجدہ کرنے والوں (کے لئے پاک رکھو)

غرض یہ رمز الٰہی تھا جو ہزاروں برس پہلے سے خدا کے علم میں تھا، اور جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ملت کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ قرار پایا، جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی آواز بلند کی تھی اور جو دنیا میں اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا، اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا جو اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور زمین پر خطیرۃ القدس کا عکس تھا۔ اس لئے حکم ہوا،

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ

اور تو جہاں بھی نکلے مسجد حرام کی طرف

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (بقرہ)   مُذکر،

درحقیقت ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ کسی بھی جگہ کھڑا ہو کر فریضۂ عبودیت ادا کرے جہاں حضرت ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے، لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر نفس یہ ممکن نہیں تو کم از کم نماز کے وقت ادھر رخ ہی کرے، ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف ہر جہت ہے، اسی لئے قبلہ کی تعیین کے موقع پر ظاہر فرمایا،

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ (بقرہ)   پھر جدھر منھ پھیرو ادھر ہی خدا کا منھ ہے

خانۂ کعبہ کی دیواریں اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود و مسجود نہیں ہے، مشرکوں، بت پرستوں اور بت پرستوں کی طرح نماز و دعا میں قبلہ سے خطاب ہوتا ہے نہ اس سمت کو مانگا جاتا ہے نہ کہ وہاں کی ذات سے، نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے، ورنہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس میں بیٹھا ہے، خانۂ کعبہ کی دیواریں اگر بالفرض ٹوٹ جائیں، اس کی چھت گر جائے اور صرف فضا باقی رہ جائے تب بھی کعبہ قبلہ رہیگا، اسی طرح خود خانۂ کعبہ کے اندر جا کر بلکہ اسکی چھت پر کھڑے ہو کر بھی نماز جائز ہے، اگر سمت قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے، تو جدھر قبلہ کا گمان ہو ادھر ہی نماز پڑھی جا سکتی ہے، سواری میں نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جا رہی ہو پڑھ سکتے ہیں، جنگ کی حالت میں سخت خوف کی صورت میں بھی نماز کے لئے قبلہ کی قید نہیں رہتی، یہ باتیں ان تمام مشرکانہ غلط فہمیوں کی جو خانۂ کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہو سکتی تھیں، قطعی تردید کرتی ہیں، اور یہی اس باب میں دین محمدی کی تکمیلی حیثیت ہے،

ے صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ بقرہ، قوله فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۔

یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز، ملّتِ ابراہیمی کے پیرو ہونے کا عملی ثبوت دنیا کے سب سے پہلے موحّدوں کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ کے پیرو ہونے کا شعار، اور مسلمانانِ عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف رُخ کرنے کو قبولِ اسلام کی علامت قرار دیا، اور فرمایا کہ "جو ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھے، اور ہمارے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھائے، وہ مسلمان ہے"[1] اگر خیال کے پر پرواز سے اڑکر فضائے آسمانی کی بلند سطح پر کھڑے ہوکر دنیا کے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں کوئی شخص دیکھے، تو نظر آئے کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے جس کے چاروں طرف تمام مسلمانانِ عالم دائرہ کی صورت میں خدا کے آگے صف بستہ اور سربسجود ہیں۔

رکعتوں کی تعداد ایک قیام اس کے بعد رکوع، پھر سجدہ، اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے۔ نماز میں کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئیں، صبح کو دو، ظہر، عصر اور عشاء کے وقت چار چار، اور مغرب میں تین، ایک رکعت کی مستقل نماز نہیں رکھی گئی، اور نہ چار سے زیادہ رکعتیں رکھی گئیں، کیونکہ مصلحت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر ہو کہ دل میں ذرا اثر بھی پیدا نہ ہوسکے، نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بددل بنادے، ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب میں خضوع وخشوع پیدا نہ ہوتا، کیونکہ صرف چند سکنڈ میں تمام ہوجاتی، اور چار سے زیادہ رکعتوں کی نماز بددلی کا باعث ہوتی، کیونکہ دیر لگنے کی وجہ سے جی گھبراجاتا، اس لئے فرض نماز کی رکعتیں دو سے کم، اور چار سے زیادہ نہیں رکھی گئیں۔

---

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فضل استقبال القبلہ۔

کہ نہ مسلمانوں کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی تھی، اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ چھپ کر وہ نماز پڑھتے تھے، اس کے لحاظ سے اُس وقت نماز میں زیادہ رکعتیں ہونا ممکن نہ تھا، اسی لئے مکہ معظمہ میں ہر نماز صرف دو رکعتوں کی تھی، جب مدینہ منورہ آ کر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر، عصر اور عشاء میں چار چار رکعتیں کر دی گئیں، لیکن مسافر کے لئے وہی دو رکعتیں قائم رہیں کیونکہ اس کی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے، جو اس تخفیف کی علت تھی، حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مقیم کے لئے چار رکعتیں ہیں، مسافر کے لئے دو، اور بحالت خوف ایک ہے، اس سے ظاہر ہو کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بنا پر ان رکعتوں کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی ہے،

مغرب اور صبح کی نمازیں قیام و سفر دونوں حالتوں میں یکساں ہیں، مغرب کی تین رکعتوں کا آدھا ممکن نہیں، اور صبح میں خود دو رکعتیں ہیں، ان میں کیا کمی ہو سکتی ہے؟ لیکن مغرب اور صبح میں یہ تین اور دو رکعتیں کیوں ہیں؟ اس کی گرہ کشائی ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمائی ہے، "مغرب میں تین اس لئے کہ وہ دن کا وتر ہے، اور صبح میں دو اس لئے کہ اس میں دو رکعتوں سے بڑھانے کے بجائے قراءت لمبی کر دی گئی ہے"،

حضرت عائشہؓ کے ارشاد میں تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے، گذر چکا ہے کہ عین طلوع اور غروب کے وقت نماز کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ کفار (آفتاب پرستوں) کی عبادت

۱؎ صحیح بخاری باب ہجرۃ و صحیح مسلم صلوٰۃ المسافر و مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۲۴۲ و ابن خزیمہ و ابن حبان و بیہقی و فتح الباری جلد اول ص ۲۳۰۔ ۲؎ صحیح مسلم صلوٰۃ مسافر۔ ۳؎ مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۲۴۱،

کا وقت تھا، مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اہلِ توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری برأت ظاہر کریں، اسی لئے اس وقت کی نماز کی رکعتوں کی تعداد وہ رکھی گئی، جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونے کا ثبوت مل سکے، یہ عدد واحد تو ہو نہیں سکتا کہ اس سے خضوع و خشوع اور تاثر کا مقصد فوت ہوتا، دو کا عدد بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ زوج اور جوڑا ہے، طاق نہیں، بنا بریں توحید کا رمز آشکارا کرنے والا سب سے قریب ترین طاق عدد تین ہی ہے جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں، نیز نماز کے خشوع و خضوع کا کمال بھی فوت نہیں ہوتا جو ایک رکعت ہونے میں فوت ہو جاتا، اس لئے مغرب میں رکعتوں کی تعداد تین رکھی گئی، اور چونکہ آفتاب کا کامل زوال و انحطاط جس کو غروب کہتے ہیں، اسی وقت ہوتا ہے اس لئے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہئے، اس مفہوم کی تشریح اس حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وتر نماز کی تاکید فرمائی ہے،

اَوْتِرُوْا یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ فَاِنَّ	اے قرآن والو، وتر (طاق) پڑھا کرو،
اللّٰہَ وِتْرٌ یُحِبُّ الْوِتْرَ،	کیونکہ خدا بھی وتر (طاق) ہے،
(ابوداؤد)	وہ وتر (طاق) کو پسند کرتا ہے،

صبح کا وقت وہ دلکش وقت ہے جب انسان پورے آرام و سکون کے بعد بیدار

لے صحیح مسلم نہی عن الصلوٰۃ فی الاوقات الثلث، ۲ عشاء کی بعد کی وتر نماز کو بھی وتر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ طاق ہوتی ہے یعنی تین جوڑوں کی وتر ہے،

ہوتا ہے یہ بڑا سہانا وقت ہوتا ہے، طبیعت موزوں ہوتی ہے، دل مطمئن ہوتا ہے، تمام عالم پر

وقت سراپا اثر و محویت نظر آتا ہے، اس لئے یہ وقت نماز و دعا کے لئے خاص طرح سے

موزوں ہے، اور قرآن مجید میں اس کی اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے

اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا — صبح کی نماز کی قرأت کا وقت حضوری کا ہوتا ہے،

(بنی اسرائیل - ۹)

اس بنا پر شریعت محمدیہ نے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد کے بجائے اس کی معنوی کیفیت کو پیش نظر رکھا، یعنی رکعتیں تو دو ہی رہیں، مگر حکم دیا گیا کہ قرأت لمبی کردی جائے اور سورتیں بڑی بڑی پڑھی جائیں، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور نمازوں کی ایک رکعت میں تقریباً پندرہ آیتیں تلاوت فرماتے تھے، مگر فجر کی نماز میں ساٹھ آیتوں سے لیکر سو آیتوں تک قرأت کرتے تھے[1] اور اسی نسبت سے رکوع و سجود بھی ہوتا تھا،

رکعتوں کی تعداد اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی سنت متواترہ سے ثابت اور تمام مسلمانوں میں تواتر سے منتقل چلی آتی ہیں، تاہم اس کا ایک شاہد قرآن پاک میں نماز خوف سے نظر آتا ہے، جس میں یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصے ہو جائیں[2] پہلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہو کر ایک رکعت ادا کرے اور دوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے پھر یہ حصہ دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے، اور دوسرا امام کے پیچھے آکر ایک رکعت ادا کرے، اس طرح امام کی دو رکعتیں ہو جاتی ہیں اور مقتدیوں کی جماعت کیساتھ ایک ایک، اور دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے تو وہ ارکان کے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصلوۃ باب القراءۃ فی الصبح و کتاب الصلوۃ باب اعتدال ارکان الصلوۃ و تخفیفہا فی تمام

ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشاروں سے علیحدہ علیحدہ ادا کرتے ہیں[1]، جب نمازِ خوف میں تصریح دو دو رکعتیں ثابت ہوئیں، تو اصل رکعتیں چار ہوں گی، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر یہی کمیت والی نمازِ خوف میں ہے، نمازِ قصر کی آیات سورہ نساء کے پندرہویں رکوع میں ہیں۔

نماز کے آداب باطنی

قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں نماز کے لئے متعدد لفظ آئے ہیں مثلاً صلوٰۃ، دعا، تسبیح، اور ذکر الٰہی اور یہ الفاظ خود نماز کے روحانی خصوصیات و آداب کو ظاہر کرتے ہیں، نماز جسم و روح دونوں کی عبادت ہے، اگر اس میں جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو اور روح میں اہتزاز نہ پیدا ہو جائے، تو ایسی نماز گلِ بے رنگ و شرابِ بے کیفیت سے زیادہ نہ ہوگی،

اقامتِ صلوٰۃ: نماز پڑھنے کے لئے قرآن پاک میں جا بجا "اقامتِ صلوٰۃ" (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو اس کے آداب ارکان و سنن کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں، چنانچہ خوف کی حالت میں جہاں نماز کے بعض آداب ارکان و شرائط کو معاف کر دیا گیا ہے، اس کے بعد ہی یہ کہا گیا ہے: فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ "پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو نماز کو قائم کرو،" اس سے معلوم ہوا کہ اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اس کے تمام آداب، ارکان و شرائط کے ساتھ بجا لائے، اس بنا پر نماز

[1] احادیث میں نمازِ خوف کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ہر مجتہد نے اپنی اپنی دلیل کے رو سے ایک ایک صورت کو مخصوص کر لیا ہے، مگر محدثین میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ سب صورتیں جائز ہیں، میرا ناقص خیال یہ ہے کہ یہ سب مختلف صورتیں لڑائی کے مختلف حالات کی بنا پر ہیں، جب جیسی صورت پیش آئی اس کے مطابق نماز ادا کی گئی، جنگ میں اشاروں سے نماز ادا کرنے کا مسئلہ امام بخاری اور بعض محدثین کا ہے

یہ تینوں ارکان کا تعلق ہے، باطنی خضوع و خشوع ملحوظ رہنا چاہیے جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے،

قنوت: نماز کے آداب باطنی میں دوسری چیز قنوت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (البقرۃ - ۳۶) اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو،

صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ پہلے نماز میں باتیں کر لیا کرتے تھے لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا کہ یہ یکسوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف تھا، قرآن پاک کی اس آیت میں جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے وہ عجیب جامع لفظ ہے، لغت میں (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہیں، چپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا، قنوت کے ان متعدد معنوں میں ہر معنی نماز میں مقصود ہیں کیونکہ نماز میں ذکر و قرأت، تسبیح و استغفار، سلام و تشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتوں اور باتوں سے (خاموشی) ہوتی ہے، وہ خدا کی بندگی بھی ہے، دعا بھی ہے، عبادت بھی ہے، قیام اور دیر تک قیام بھی ہے، اور عاجزی کا اظہار بھی ہے، اگر ان میں سے کوئی چیز بھی کسی نماز میں نہ ہو تو اسی قدر نماز کے اوصاف میں کمی ہو جائے گی،

خشوع: تیسری چیز خشوع ہے چنانچہ قرآن پاک میں نمازیوں کی یہ صفت آئی ہے،

اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (مومنون) (وہ مومنین کامیاب ہیں) جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع کرتے ہیں،

خشوع کے لغوی معنی یہ ہیں، بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھیں نیچی ہونا، یعنی آدمی

مسکنت، عاجزی اور تواضع ظاہر ہونا (لسان العرب) اس لئے نماز خدا کے سامنے شکستگی، بیچارگی اور افتادگی کا اظہار ہے، اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہوگئی۔

تبتّل: تبتّل کے اصلی معنی کٹ جانے کے ہیں، اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا، یہ ہر چند کہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی منصب ہے، مگر قرآن پاک میں جہاں اس کا حکم ہے، سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز ہی سے متعلق ہے، چنانچہ سورۂ مزمل میں ہے،

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ. قُمِ الَّيْلَ اِلَّا	اے کملی اوڑھنے والے! تھوڑی دیر
قَلِيْلًا. نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ	کے سوا رات بھر نماز پڑھ،
قَلِيْلًا. اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ	آدھی رات، یا اس سے کچھ کم یا زیادہ،
الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا. اِنَّا سَنُلْقِيْ	اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر
عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا. اِنَّ نَاشِئَةَ	ایک بھاری بات اتارنے والے ہیں،
الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ	بیشک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے میں
قِيْلًا. اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا	طمانیت قلب کا زیادہ موقع ہے اور
طَوِيْلًا. وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ	قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لئے زیادہ
تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا.	موزوں ہے، تیرے لئے دن کو بڑی
(مزمل - ۱)	فرصت ہے، اپنے پروردگار کا نام لے،
	اور ہر چیز سے کٹ کر اس کی طرف ہو جا،

نے فرمایا کہ نماز میں جب تم پر نیند غالب آئے تو سو جاؤ، کیونکہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کے بجائے اپنے کو برا بھلا کہنے لگو۔[1] دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا نمازی کو جب نیند آجائے تو سو جانا چاہیے تاکہ وہ جو کہتا ہے، وہ سمجھے۔[2] حاکم کی مستدرک میں ہے کہ آپ نے فرمایا جو شخص اچھی طرح وضو کرے، پھر اس طرح نماز پڑھے کہ وہ جو کہتا ہے، اس کو سمجھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ نماز ختم کرے، تو وہ ایسا ہو جاتا ہے، کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔[3]

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہیں جن کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت، خود نماز سے غفلت ہے، اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لحاظ نہ رکھنا بھی غفلت ہے، اور اس لئے اس آیت ذیل کے مصداق دونوں ہیں۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ	پس پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی
عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ	نماز سے غفلت برتتے ہیں جو دکھاوے
هُمْ يُرَاءُونَ (ماعون - ۱)	کی نماز پڑھتے ہیں۔

ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے "ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں پھٹکار ہو"۔ نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہیں، کہ نماز کے لئے جو ظاہری آداب مثلاً وقت کا لحاظ، اور اس کے ارکان میں اعتدال وغیرہ اور جو باطنی آداب مثلاً خشوع و خضوع، تضرع و زاری

---

[1] صحیح بخاری کتاب الوضوء باب الوضوء من النعس فی صلاتہ جلد ۱ ص ۳۴ [2] صحیح بخاری، ابو داؤد و مسند احمد عن انس [3] مستدرک، ترغیب و ترہیب منذری جلد ۱ ص ۸۰۔ [4] خصوصاً اس سے ان مسلمانوں کو جو عربی زبان نہیں جانتے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور چاہیے کہ نماز میں جو سورتیں اور دعائیں وہ پڑھتے ہیں، اُن کے معنی ذہن نشین کریں یہ ہر مسلمان کے لئے بہت آسانی سے ممکن ہے، بشرطیکہ وہ تھوڑی توجہ کرے۔

اور فہم و تدبر وغیرہ ضروری ہیں، اُن سے نماز میں تغافل برتا جائے۔

نماز کے گذشتہ آداب کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات تعلیمات اور عملی مثالیں ہیں جن میں آپؐ نے نماز کی اصلی حقیقت کو آشکار کیا ہے، ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک شخص نے آکر نہایت عجلت میں نماز پڑھی آپؐ نے فرمایا: اے شخص! نماز پھر پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی، اس نے دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی، آپؐ نے پھر وہی ارشاد فرمایا جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ! کیسے نماز پڑھوں، فرمایا اس طرح کھڑے ہو، اس طرح قرات کرو، اس طرح اطمینان اور سکون کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرو۔[1]

نماز میں ادھر ادھر دیکھنا خشوع کے منافی ہے، اس سے نماز کی توجہ منتشر اور حضور قلب میں خلل پڑتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز میں سر اوپر اٹھا کر نہ دیکھا کرو، کیا تمھیں یہ ڈر نہیں کہ تمہاری نظر چھین لی جائے،[2] آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جب تک بندہ نماز میں دوسری طرف متوجہ نہیں ہوتا خدا اس کی طرف متوجہ رہتا ہے، اور جب وہ خدا کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے تو خدا بھی اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے،[3] [illegible] میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا جب تم میں کوئی شخص نماز کیلئے کھڑا ہو تو وہ خدا کی جانب پوری طرح متوجہ رہے، یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے، اور نماز میں منہ پھیر کر ادھر ادھر نہ دیکھو، کیونکہ جب تک تم نماز میں خدا سے باتیں کر رہے ہو۔ مسند بزار میں ہے کہ جب بندہ نماز میں ادھر ادھر دیکھتا ہے تو خدا

---

[1] صحیح بخاری، صحیح مسلم و ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ [2] مسند عن جابر بن سمرۃ [3] مسند احمد جلد ۵ ص ۱۷۲
ابوداؤد باب الالتفات فی الصلوٰۃ [4] [illegible] ابی ہریرہ [illegible] جلد ۲ ص ۸۰

نماز میں سکون و اطمینان پیدا کرنے کی کئی آپ نے ہدایتیں فرمائی ہیں، ارشاد ہوا کہ جب نماز ہو رہی ہو (اور تم باہر سے آؤ) تو دوڑ کر مت آؤ، بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون و وقار طاری ہو[1] اس سے اول تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پر سکون و اطمینان طاری رہے، دوسرے یہ کہ اس کی دوڑ دھوپ سے دوسرے نمازیوں کے سکون میں خلل نہ آئے، اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہوں تو نماز سے پہلے اُن سے بھی فراغت کر لینی چاہئے، مثلاً بھوک ہو اور کھانا [illegible] اور ادھر جماعت کھڑی ہو رہی ہو تو پہلے کھانا کھا لینا چاہئے تاکہ نماز اطمینان سے ادا ہو[2] اسی طرح اگر استنجا یا قضائے حاجت کی ضرورت ہو تو پہلے اس سے فراغت کر لیجائے تب نماز پڑھی جائے[3]

آغاز اسلام میں لوگ نماز کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے، لیکن مدینہ آکر یہ اجازت منسوخ ہوگئی، ایک صحابی جن کو اس کی خبر نہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی دفعہ نماز میں سلام کیا، اور جب آپ نے جواب نہ دیا، تو نماز کے بعد انہوں نے اس کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا:[4]

إِنَّ فِي الصَّلَاةِ لَشُغْلًا، نماز میں اور ہی مصروفیت ہوتی ہے،

نماز پڑھتے وقت ایسے کپڑے پہننا یا سامنے ایسا پردہ لٹکانا جن کے نقش و نگار میں دل محو ہو جائے اور توجہ ہٹ جائے، مکروہ ہے، ایک دفعہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گل بوٹوں کی ایک چادر اوڑھ کر نماز پڑھی، پھر فرمایا، اس کے گل بوٹوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا اس کو جہم

---

۱ صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار ۲ صحیح بخاری و مسلم و ابو داؤد و ترمذی باب کراہیۃ الصلوٰۃ بحضرۃ
الطعام ۳ صحیح مسلم و ابو داؤد و ترمذی ۴ ابو داؤد و ترمذی و نسائی و صحیح مسلم باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ

رات کی نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عجیب ذوق و شوق کا عالم طاری ہوتا تھا، قرآن پڑھتے چلے جاتے، جب خدا کی عظمت و کبریائی کا ذکر آتا، پناہ مانگتے، جب رحم و کرم کی آیتیں تو دعا کرتے[1]۔ آپ نے فرمایا کہ "نماز دو دو رکعت کر کے ہے، اور ہر دوسری رکعت میں تشہد ہے اور تضرع و زاری ہے، خشوع اور خضوع ہے، عاجزی اور مسکنت ہے، اور ہاتھ اٹھا کر اے رب اے رب کہنا ہے، جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص رہی"[2]۔

ایک دفعہ آپ اعتکاف میں تھے، اور لوگ مسجد میں زور زور سے قرأت کر رہے تھے، آپ نے فرمایا لوگو! تم میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے، تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اور ایک دوسرے کی مناجات میں، اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو[3]۔

ایک صحابی نے درخواست کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو کچھ نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تمہاری نماز ایسی ہونی چاہیئے گویا یہ سمجھ کر کہ تم اس وقت دنیا کو چھوڑ رہے ہو[4]۔ کیا نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے؟

ان پوری تفصیلوں سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی نماز کیا ہے، اور قرآن کس نماز کو چاہتا ہے، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی عملی تفصیلیں کیا کیا ہیں؟ اور اگر نماز یہ نماز ہو تو وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا موثر ذریعہ ہو؟ اسی لئے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے۔

۱؎ مسند احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۲۳۔ ۲؎ ابوداؤد باب صلوٰۃ النہار و ترمذی باب ماجاء فی التخشع فی الصلوٰۃ مطبوعہ دہلی۔ ۳؎ ابوداؤد صلوٰۃ اللیل۔ ۴؎ مسند احمد جلد ۵ ص ۴۱۲، عن ابی ایوب۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ	اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ	وہ قرآن کو مانتے ہیں اور وہ اپنی
يُحَافِظُوْنَ ۔ (انعام)	نماز کی نگہداشت کرتے ہیں ۔

نماز کی اس نگہداشت اور محافظت کے دو معنی ہیں، اور دونوں یہاں مقصود ہیں یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل، اور دوسرے اسکے باطنی آداب کی رعایت

نماز کے خلقی، تمدنی اور معاشرتی فوائد

نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا، اور دل کی تسکین کا سامان ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، خلقی، تمدنی، اور معاشرتی، اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے خلق و تمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں، ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت نصیب ہوا، اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک نیم بدوی، وحشی، اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا، چند سال میں ادب تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا، اور آج بھی، اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے مہذب و متمدن ہو جاتا ہے، متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے، اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے جس کے سبب سے ان کا دینی کام جو پہلے محض رسمی تھا، اب یکسر [illegible] جاتا ہے!

ستر پوشی

نماز کے ان تمدنی فوائد میں، بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے۔ انسان کو شروع ہی ان نگہداشت سے نہ تھی اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے، عرب کے

بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے، یہانتک کہ غیر قریشی عورتیں جب حج کے لئے آتی تھیں، تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھیں، اور ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں، اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا، یہانتک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اسکے نزدیک نماز بھی درست نہیں، آیت نازل ہوئی،

خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ — ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو،

(اعراف - ۳)

مردوں کے لئے کم از کم ناف سے گھٹنے تک، عورتوں کے لئے پیشانی سے لیکر پاؤں تک چھپانا نماز میں نہایت ضروری قرار پایا، اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو جہاں جہاں اسلام گیا وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا، اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کیلئے ان کو ستر پوش بنا دیا، افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لباسوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے، دوسری طرف متمدن قومیں زیب و زینت اور حسن و آرائش اور تمدن کی بے اعتدالی سے بے حیائی پر اتر آتی ہیں، مرد گھٹنوں سے اونچا لباس اور عورتیں نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہیں، نماز ان کی بھی صحیح کرتی ہے اور متمدن قوموں کو اعتدال سے تجاوز نہیں کرنے دیتی، چنانچہ عورتوں کو تیز خوشبو لگا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا، اور بے حیائی کے کپڑوں سے پہننے سے عموماً روک دیا اور کہدیا ہے، کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی،

طہارت

۲۔ اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے جو اسلام کے دینی احکام میں سب سے پہلا ہے۔ اقرأ کے بعد دوسری ہی وحی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس میں یہ حکم تھا،

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (مدثر-۱) اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ،

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے، اور نماز کی درستی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہوں، اہل عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت و نظافت کی مطلق تمیز نہ تھی، یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجد نبوی میں آکر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا، صحابہ اس کو مارنے دوڑے، آپ نے ان کو روکا، اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ "یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے، اس قسم کی نجاستوں کے لئے موزوں نہیں ہے" اور صحابہؓ سے فرمایا کہ اس نجاست پر پانی بہا دو، ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپ گذرے تو فرمایا کہ "اس قبر والے پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا، غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لئے تھی، اہل عرب اور عام مسلمانوں کو پاک صاف رہنے کا خوگر بنایا، اور استنجا، بیت الخلا اور طہارت کے وہ آداب سکھائے، جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی ناآشنا ہیں،

نجاستوں سے اپنے بدن، کپڑے، اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم وہی جو صحابہ تمام

کا اہتمام کرتے تھے، خدا نے اُن کی مدح فرمائی۔

فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ ، (توبہ - ۳)

اس میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ وہ پاک و صاف رہیں اور اللہ پاک و صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

جب اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کر سکتا ہے۔

صفائی

۳- نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور لباس کے پاک اور ستھرا رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منہ، ہاتھ، پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں اُن کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے۔ ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا کہ آج کل کے جراثیم کے نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریاں ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہیں، اور ناک کے نتھنوں میں پانی ڈال کر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہیں۔ دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں ہے جس نے ناک میں پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو، حالانکہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر حقیقی اصول پر مبنی ہیں۔ نمازیوں کو پنج وقتہ وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہو کہ یہ حکم اس ملک میں نازل ہوا، جہاں پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے۔

اہل عرب اور خصوصاً بدو دانتوں کو بہت کم صاف کرتے ہیں جس سے گندہ دہنی اور بدبو
کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہر نماز کے وقت
مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہونچ گئی، اور فرمایا کہ "اگر میری امت
پر یہ شاق نہ گذرتا، تو میں اس کو ضروری قرار دیدیتا"۔

اسی پانی کی کمی کی وجہ سے عرب نہاتے کم تھے، ان کے کپڑے موٹے اون کے ہوا
کرتے تھے، وہ محنت مزدوری کرتے تھے، جس سے پسینہ میں تر بتر ہو جاتے تھے، اور چونکہ ایک
ایک کپڑے کو ہفتوں پہنتے رہتے تھے، اس لئے جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے، تو ان کے بدن
و کپڑوں سے بو آتی تھی، اس بنا پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز سے پہلے
غسل کرنے کی بڑی تاکید کی ہے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا،

غسل یوم الجمعة واجب علی کل	جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری
محتلم (بخاری کتاب الجمعہ)	ہے،

اس کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو لگانا وغیرہ نظافت کے
دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا، جنابت کی حالت میں غسل کرنا فرض قرار دیا جس کے بغیر کوئی نماز ہوتی
ہی نہیں، فرمایا،

وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا	اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر خوب
(مائدہ)	پاک ہو جاؤ،

پابندی وقت

۴۔ انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام کام مقررہ

اوقات پر انجام پائیں۔ انسان فطرتاً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے، اس کو پابندِ وقت
بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیئے جائیں جیسا کہ
کاروبار کے کاموں میں آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے
دوسرے کاموں کے اوقات بھی اُن کی خاطر مقرر کر لیتا ہے، اور اس طرح اس کی زندگی
باقاعدہ ہو جاتی ہے، اور اس کا وقت فضول برباد نہیں ہوتا۔ نماز کے اوقات چونکہ
مقرر ہیں اس لئے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں، خصوصاً نماز باجماعت کے، اُن کے اوقات
خود بخود منظم ہو جاتے ہیں، اُن کے دن رات کے کام وقت پر انجام پاتے ہیں اور نماز کے
اوقات اُن کے کاموں کا معیار ہو جاتے ہیں، وقت پر سونا، اور وقت پر اٹھنا ان کے لیے
ضروری ہو جاتا ہے۔ مشہور صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کا مقولہ ہے۔

الصّلوٰۃ مکیال فمن اوفیٰ وفی	نماز ایک پیمانہ ہے جس نے اس کو پورا
بہ ومن طفف فقد علمتم	کیا پورا ناپ کر دیا گیا اور جس نے
ما للمطففین ؏	اس میں کمی کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی خبر ہے

اس قسم کے جسمانی اور عصبی ہو سکتے ہیں یہی ہو سکتا ہے کہ نماز مسلمان کے کام
کا پتہ نہ ہو ان سے اس کی مزید تائید کی جا سکتی ہے

صبح خیزی

(د) طب و حفظانِ صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو خصوصاً آفتاب
سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے، وہ مخفی نہیں، جو لوگ نماز کے پابند ہیں، وہ اس پر

۱؎ کنز العمال مندوبات الصلوٰۃ، جلد چہارم ص ۲۳۰، بحوالہ مصنف عبدالرزاق۔

کہ انسان ورزش بھی نہیں کر سکتا جب تک رات کو وقت پر سویا نہ جائے گا، صبح کو وقت پر
اٹھ نہیں سکتی، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو نماز عشاء کے بعد بیکار باتیں کرنے
سے اور قصہ کہانی کہنے سے منع فرمایا ہے[1]، کہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے، اور صبح خیزی
مسلمانوں کی عادت ہو جائے، اور صبح کو موذن کی پر تاثیر آواز:-

اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ — سونے سے نماز بہت بہتر ہے،

ان کو بتا بتا کر اپنے وقت بستر سے اُٹھا دے،

خدا کا خوف

۲۔ ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے جب کبھی نفس کی بدی یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈگمگاتا ہے تو
اسی دم، اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے، اُس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے، اس کو اپنے خدا کے سامنے
جانے سے شرم آتی ہے، اُس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے، وہ لوگوں سے اس بنا پر شرماتا ہے
کہ وہ کہیں گے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے، اس کے پاؤں بدی کے
راستہ پر پڑتے وقت کانپتے ہیں، غرض نماز انسان کے اخلاقی حاسہ کو بیدار کرتی ہے، اور برائیوں
سے بچاتی ہے، اور خود قرآن نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے،

إِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ — بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں
وَالْمُنْكَرِ ۔ (عنکبوت - ۵) — سے روکتی ہے،

ہوشیاری

۳۔ نماز عقل و ہوش، بیداری، اور آیات الٰہی میں تدبر اور غور، خدا کی تسبیح و تہلیل، اور
اپنے لئے دعائے مغفرت کا نام ہے، اس لئے وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم

[1] بخاری کتاب المواقیت باب ما یکرہ من السمر بعد العشاء،

اجتماع کے لیے کوئی مشغلہ مقرر کرے، جس سے قلبِ انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھا سکے
اور اجتماعیت پیدا ہو کر بدی کے بجائے نیکی کے رُخ کی طرف جائے۔ چنانچہ اسلام نے [illegible] روزانہ
جماعت کی عام نمازیں، ہفتہ میں جمعہ کی نماز اور سال میں دو دفعہ عیدین کی نمازیں مقرر کیں کہ جماعت
کا فطری تقاضا بھی پورا ہو، اور مشرکانہ بدیوں اور اخلاقی برائیوں سے بھی حفاظت رہے کہ اس اجتماع کی
بنیاد ہی دعوتِ خیر پر رکھی گئی ہے۔ حج کے عالمگیر مذہبی اجتماع میں دوسرے اجتماعی و انتظامی
مقاصد کے برقرار رکھنے کے ساتھ اس کے مشاغل بھی خدا کے ذکر اور اس کی بارگاہ میں دعا و
انابت کو قرار دیا جس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگی خیال اور اخلاص عمل کی بنیاد پر قائم

کاموں کا تنوع

۱۴۔ انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہمہ رنگی کے باوجود تنوع اور تجدد کا طالب ہے،
لیکن اگر انسان کے دل و دماغ اعضاء و جوارح ہر وقت ایک ہی کام میں مصروف رہیں تو
سکون و اطمینان عیش و راحت اور دلچسپی کی لذت، جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے مفقود ہو جائے
مفید سے مفید کام سے بھی دنیا چیخ اٹھے، اسی لیے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مناسب
طریقے پر کی ہے جس میں انسان کو حرکت و سکون دونوں کا یکساں موقع میسر آتا ہے۔ رات اور
دن کی خلقت کی بنا پر آیات الٰہی میں شمار کیا گیا ہے کہ اس تغیر و تبدل سے نظام عالم میں
نیرنگی پیدا ہوتی ہے اور اس تقسیم سے انسانوں میں ہر کام کی لذت قائم رہتی ہے۔ نماز ایک
فریضہ ہے جو نہ تو ہر لمحہ اور ہر لحظہ انسان پر فرض ہے، اور نہ سال میں ایک دفعہ یا عمر بھر میں
صرف ایک دفعہ فرض ہے، بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ صبح سے کام شروع کیا
تو ظہر پر آ کر توڑ دیا، پھر مشغولیت ہوئی اور عصر پر پہنچ کر ختم ہوئی، پھر جو سلسلہ چھڑا تو

پڑھتے تھے، لیکن ذہنی مصروفیت شروع ہوئی، اور عشا پر جاکر منتہی ہوئی، اب نیند آگئی، اور
صبح تک بے خبری رہی، اٹھے تو دماغوں کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا، وہ دولتمند جو
جسمانی یا دماغی محنت و مشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہیں حاصل کرتے وہ اس روحانی انبساط اور
روحانی لذت سے آگاہ نہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان چند گھنٹوں تک ایک ہی قسم کی محنت کرکے جو
سستی جمود پیدا ہوگیا تھا، وہ چند منٹ میں ہاتھ منہ دھو کر دعا و تسبیح، نشاط و بشاشت کے ذریعہ اس سے
پاک ہوگیا، اور پھر سے اس نے اپنے کام کے لئے نئی قوت پیدا کرلی،

تربیت

۵- انسان کی ترقی کامیابی، استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے کہ جس کام کو اس نے شروع
کیا ہے، برابر اس پر عمر بھر قائم رہے، اسی کا نام عادت و اخلاق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی ہے،
اس لئے اس اخلاق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو تو وہ ضرور ہے کہ روزانہ ہو،
پنجگانہ نماز کا یہ فریضہ ہے جس سے بڑھ کر اس عہدہ برآ ہونے کے لئے انسان میں
استقلال، مواظبت اور مداومت شرط ہے، اس لئے انسان میں اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے
کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی، اس لئے قرآن پاک نے صحابہ کی مدح میں کہا

الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ۔ (معارج - ۱) — جو اپنی نماز مداومت کے ساتھ ادا کرتے ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

أَحَبُّ الْعَمَلِ إِلَى اللّٰهِ أَدْوَمُهُ وَإِنْ قَلَّ — محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے، گو وہ کم ہو،
([illegible] باب [illegible] القصد)

تنظیم جماعت

۱۴- کسی قوم کی زندگی اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، جہاں یہ رشتہ ٹوٹ جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے۔ اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا نقشہ کھینچ دیا تھا، کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے سے شانہ سے شانہ ملانا، یکساں حرکت و جنبش کرنا، ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار ہے۔ جس طرح نماز کی درستی صف اور نماز جماعت کی درستی پر موقوف ہے، اسی طرح پوری قوم کی زندگی کی باہمی تعاون، تحفظ، اشتراک، میل جول، اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفوں کی درستی پر بہت زور دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہو گے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے۔[1]

مساوات

۱۵- یہی جماعت کی نماز مسلمانوں میں برادرانہ مساوات اور اسلامی برادری کی درسگاہ ہے۔ یہاں امیر و غریب، کالے گورے، رومی و حبشی، عرب و عجم کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ سب ایک ہی درجہ اور ایک صف میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں۔ جماعت کی امامت کے لئے حسب نسب، نسل و خاندان، رنگ روپ، قومیت اور حیثیت، عہدہ و منصب کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ علم و دانش، فضل و کمال، اور تقویٰ و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں شاہ و گدا، اور شریف و رذیل کا تفرقہ نہیں، سب ہی یکساں، سب برابر ہیں۔ امام کے پیچھے ایک صف میں دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں۔ اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف، مسند دارمی جلد ۱، ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف

کرنے میں غفلت کریں گے،

معیار فضیلت

۱۹۔ نماز کی امامت کے لئے چونکہ سوائے علم و فضل اور تقویٰ کے کوئی اور قید نہیں ہے اور ان صفات کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کیلئے ہر وقت ممکن ہے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحب علم (اقرأ) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے، ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے آئے، آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ تم میں سے جس کو قرآن زیادہ یاد ہو وہ امام بنے، اتفاق یہ کہ اُن میں سے جو صاحب سب سے زیادہ کمسن تھے، ان ہی کو قرآن زیادہ یاد تھا، چنانچہ لوگوں نے ان ہی کم سن صحابی کو اپنا امام مقرر فرمایا، اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں اس کے ذریعہ سے علمی و عملی فضائل کے حاصل کرنے کی تشویق و ترغیب بھی پیدا ہوتی ہے،

روزانہ کی مجلس عمومی

۲۰۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا، یا کوئی سیاسی و قومی مشکل پیدا ہوتی یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوتی، تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے) سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے، اور اس امر اہم سے اطلاع پاتے، یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے، یہ گویا مسلمانوں کے مذہبی، اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا جس کے لئے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کو کسل و سستی کے بہانہ کے بغیر جمع ہونا ضروری تھا۔

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار اور اس کے[1] مذہبی و اجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے، اس کی شیرازہ بندی

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ،

مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا، اور اسی کی گرہ کھل جانے سے تمام نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے
مسجد مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز، اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی۔ جس طرح
آج ہر جلسہ کا افتتاح ... العرب ... تقسیم کیلئے ... خطبات سے ہوتا ہے، اسی طرح
مسلمان جب زندہ تھے، اُن کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا۔ اُن کی ہر چیز اس کے
تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی۔ اُن کی نماز کا گھر ہی اُن کا دار الامارہ تھا، وہی دار الشوریٰ
تھا، وہی بیت المال تھا، وہی محکمۂ جنگ کا دفتر تھا، وہی درسگاہ، وہی معبد تھا،
جماعت کی ہستی کی بنیاد، افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے، اور جماعت کے فائدہ کیلئے
افراد کا اپنے ہر آرام و عیش اور فائدہ کو قربان کر دینا اور تفرقۂ باہمی کو ترک کرکے صرف ایک
مرکز پر جمع ہو جانا ہستی کی وحدت پیدا ہو جانا۔ اس کے حصول کی لازمی شرط یہی ہے کہ
کسی ایک کو امام و قائد و سردار لشکر مان کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے
مسجد کی نماز انہی رموز و اسرار کا گنجینہ ہے۔ یہ مسلمانوں کو نظم و جماعت، اطاعت پذیری و
فرمانبرداری اور وحدت و قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے، اسی لئے اس کے بغیر
مسلمان مسلمان نہیں، اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے، نہ انقیاد و امامت، نہ زندگی
اور نہ زندگی کا نصب العین۔ اسی بنا پر داعیٔ اسلام علیہ السلام نے یہ فرمایا:

العهد الذي بيننا وبينهم	ہمارے اور اُن کے درمیان جو معاہدہ ہے
الصلاة فمن تركها فقد كفر	وہ نماز ہے تو جس نے اس کو چھوڑا اس نے
(احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)	کفر کا کام کیا۔

ان کو ذکرِ الٰہی سے غافل نہ کرسکیں،

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ	ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت
عَن ذِكْرِ اللَّهِ (نور - ۵)	کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتا،

اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے غرض ہر حال میں اُن کے اندر خدا کی یاد کے لئے بیقراری تھی،

يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا	جو خدا کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یاد
وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ (آل عمران ۲۰)	کرتے ہیں،

راتوں کو جب غافل دنیا نیند کے خمار میں ہوتی، وہ بستروں سے اٹھ کر خدا کے سامنے

عجز و نیاز میں مصروف ہوتے تھے۔

تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ	ان کے پہلو (رات کو) خوابگاہ سے
يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا	علحدہ رہتے ہیں، وہ خوف اور امید
(سجدہ ع - ۲)	ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں،

وہ جن کا یہ حال تھا کہ

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے
(مرسلات - ۲)	آگے جھکو، تو نہیں جھکتے

اب اُن کی یہ حالت ہوگئی کہ

تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا	تم ان کو دیکھوگے کہ رکوع میں جھکے ہو
مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا (فتح - ۴)	اور سجدہ میں پڑے ہوئے خدا کا فضل اور

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی کہ

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ	اور جب تنہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان
قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ	کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے
بِالْاٰخِرَةِ (زمر-۵)	مکدر ہو جاتے ہیں،

آفتابِ نبوت کے پرتو نے ان مکدر آئینوں میں خشیتِ الٰہی کا یہ جوہر پیدا کر دیا،

اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ	وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے
قُلُوْبُهُمْ، (انفال-ع۱)	تو اُن کے دل دہل جاتے ہیں،

یہ خود قرآنِ پاک کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے عمل و تعلیم نے عرب کی روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا، وہ تمام لوگ جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے، خواہ وہ کھیتی کرتے ہوں یا تجارت یا محنت مزدوری، مگر ان میں کوئی چیز اُن کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھی، قتادہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (صحابہ) خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا، تو یہ شغل و عمل ان کو یادِ خدا سے غافل نہیں کرتا تھا، بلکہ وہ اس کو پوری طرح ادا کرتے تھے[1] حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ بازار میں تھے، نماز کی تکبیر ہوئی تو دیکھا کہ صحابہؓ فوراً دوکانیں بند کر دیں اور مسجد میں داخل ہو گئے[2]

صحابہ تمام تر راتیں خدا کی یاد میں جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے، یہاں تک کہ سفر کی غیر مطمئن راتوں میں بھی وہ عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے. خدا نے گواہی دی،

---

[1] صحیح بخاری باب التجارت فی البر مسلم [2] فتح الباری جلد ۴ ص ۲۵۳ بحوالہ عبد الرزاق،

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ	بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ دو تہائی
أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ	رات کے قریب اور آدھی رات اور
وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ	ایک تہائی رات تک کھڑا رہتا ہے اور
مَعَكَ ۚ	تیرے ساتھ کی ایک جماعت بھی
(مزمل-۲)	اٹھ کر نماز پڑھتی ہے،

اس زمانہ میں صحابہ کو دشمنوں کے سوا خدا کو یاد کرنے کا موقع کہاں ملتا تھا، جو وہ دیدار کے مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہیں کسی مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے، ذوق و شوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے رکھ دیتے تھے، اور بہت سجدہ میں پڑے رہتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان کے اس والہانہ انداز عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے، قرآن پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے،

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ	اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر
الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ	جو تجھ کو جب تو (نماز) کے لئے اٹھتا ہے
وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ	اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے
(شعراء-۱۱)	درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا ہے،

مدینہ منورہ میں آکر سب سے پہلا فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَطْعِمُوا الطَّعَامَ	اے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ
وَافْشُوا السَّلَامَ وَصَلُّوا	اور سلام کو پھیلاؤ اور نماز پڑھو جب

اَلنَّاسُ نِیَامٌ، (ترمذی) لوگ سوتے ہوں،

بعض صحابہؓ نے اس حکم پر شدت سے عمل کیا، کہ انھوں نے راتوں کا سونا چھوڑ دیا آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا، چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ
رات بھر نماز میں مصروف رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ عثمان! تم پر
جسم کا بھی تم پر حق ہے، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی،[1] حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ صحابہ راتوں کو
اٹھ اٹھ کر نماز پڑھتے تھے، اور بہت کم سوتے تھے،[2] حضرت ابوہریرہؓ نے رات کے تین حصے
کر دیئے تھے، ایک میں خود نماز پڑھتے تھے، دوسرے میں ان کی بیوی، اور تیسرے میں ان کا
غلام، اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا،[3]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم
ہوا تو ان کو جا کر نصیحت فرمائی،[4] حضرت ابو درداء صحابیؓ کا بھی یہی حال تھا، کہ وہ رات رات بھر
عبادت میں گذار دیتے تھے، حضرت سلمان فارسیؓ ان کے اسلامی بھائی تھے، ایک شب وہ ان کے ہاں جا کر
قیام پذیر ہوئے، جب رات کو حضرت ابو درداءؓ عبادت کے لئے اٹھنے لگے، تو حضرت سلمانؓ نے منع
کیا، پچھلے پہر جب سناٹا چھایا ہوا تھا حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا کہ اب نماز کا وقت ہے،[5] کوئی صحابی
ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت بھی نماز عمداً قضا کی ہو، یہاں تک کہ لڑائی
خطرہ کی حالت میں بھی وہ اس فرض سے غافل نہیں رہتے تھے، ایک صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ابوداؤد باب القصد فی الصلوٰۃ [2] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ فی وقت قیام النبی صلعم من اللیل [3] بخاری
کتاب الاطعمہ باب التکلف [4] بخاری کتاب الصوم [5] ایضاً

نے ایک جگہ بنام مکے لئے کہیں بھیجا تھا، جب وہ منزل مقصود کے قریب پہونچے تو عصر کا وقت ہوچکا تھا، اُن کو خوف تھا کہ اگر کہیں ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائیگا تو وقت نکل جائیگا اور اگر عصر میں تاخیر کی جائے تو حکم نبی کی تعمیل میں دیر ہو جائے گی، اس مشکل کا حل انھوں نے اس طرح کیا کہ وہ اشاروں میں نماز پڑھتے جاتے اور چلتے جاتے تھے[1]، سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی نماز اُن سے ترک نہیں ہوتی تھی، چنانچہ بیماری کی حالت میں وہ دوسروں کا سہارا لے کر مسجد میں حاضر ہوتے تھے[2]، پھر وہ جس خضوع وخشوع محویت واستغراق کیساتھ نماز ادا کرتے تھے اُس کا نفس پر بڑا اثر پڑتا تھا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو اُن پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی کہ کفار عورتوں اور بچوں تک پر بھی اس کا اثر ہوتا تھا[3]، حضرت عمرؓ نماز میں اس زور سے روتے تھے کہ اُن کے رونے کی آواز پچھلی صف تک جاتی تھی[4]، حضرت تمیم داریؓ ایک رات تہجد کے لئے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صبح کر دی، بار بار اسی کو دہراتے تھے، اور مزے لیتے تھے[5]،

ع شب شود صبح و ہمان محو تماشا باشم

حضرت انسؓ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہیں[6]، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے، تو کئی کئی سورتیں پڑھ ڈالتے تھے، اور

---

[1] ابوداؤد باب صلوۃ الطالب [2] نسائی کتاب الامامۃ باب المحافظۃ علی الصلوۃ [3] صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب اذا بکی الامام فی الصلوۃ [4] صحیح بخاری کتاب الہجرۃ و کتاب الصلوۃ باب المسجد یکون فی طریق [5] اسد الغابہ تذکرہ حضرت تمیم داری [6] صحیح بخاری باب المکث بین السجدتین،

اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کوئی ستون کھڑا ہے، اور جب سجدہ میں جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے، کہ حرم محترم کے کبوتر ایک سطح جامد سمجھ کر ان کی پیٹھ پر آ کر بیٹھ جاتے تھے[1]

ایک رات میدانِ جنگ میں ایک پہاڑی پر دو صحابی پہرہ دینے کے لئے متعین ہوتے ہیں، ایک صاحب سو جاتے ہیں، اور دوسرے نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، دشمن ان کو تک کر تیر مارتا ہے جو بدن میں ترازو ہو جاتا ہے، کپڑے خون میں تر بتر ہو جاتے ہیں مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے، نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے، اور واقعہ سناتے ہیں ساتھی کہتے ہیں کہ تم نے مجھے اس وقت کیوں نہ جگایا، جواب ملتا ہے کہ میں نے ایک پیاری سورہ شروع کی تھی، پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کئے بغیر نماز توڑ دوں۔[2]

اس سے بھی زیادہ پر اثر منظر یہ ہے کہ دشمنوں کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں، تیروں کا مینھ برس رہا ہے، نیزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کوند رہی ہیں، سر و گردن، دست و بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں، کہ دفعۃً نماز کا وقت آجاتا ہے، فوراً جنگ کی صفیں نماز کی صفیں بن جاتی ہیں، اور ایک اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ موت و حیات سے بے پروا ہو کر گردنیں جھکتی اور اٹھتی ہیں

نور کا تڑکا ہے، اسلام کے دائرہ کا مرکز فاروق اعظمؓ امام نماز ہیں، پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں، دفعۃً ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر شکم مبارک کو چاک کر دیتا ہے، آپ غش کھا کر گر پڑتے ہیں، خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر نماز کی صفیں اپنی جگہ پر قائم ہیں، حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہیں، صبح کی دوگانہ

---

[1] حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ، اصابہ و اسد الغابہ وغیرہ [2] ابو داؤد، کتاب الطہارۃ باب الوضوء من الدم

ادا ہو چکتا ہے، تب غنیمہ وقت کو اٹھ پاتا ہے[1]۔

حضرت عمرؓ کو جس صبح کی نماز میں زخم لگا، اس کے بعد کی صبح کو لوگوں نے اُن کو نماز کے لئے جگایا، تو بولے ہاں جو شخص نماز چھوڑ دے، اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں، چنانچہ اسی حالت میں کہ زخم سے خون جاری تھا، آپ نے نماز پڑھی[2]۔

حضرت علی مرتضیٰؓ صبح کی نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوتے ہیں، یا صبح کی نماز میں ہوتے ہیں[3]، ابن ملجم کی تلوار ان کو گھائل کرتی ہے، اور کچھ دیر کے بعد وہ داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ امام مظلوم حسین بن علیؓ کربلا کے میدان میں رونق افروز ہوتے ہیں، عزیزوں اور دوستوں کی لاشیں میدانِ جنگ میں نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہیں، ہزاروں اشقیا آپ کو نرغہ میں لئے ہوتے ہیں، اتنے میں ظہر کا وقت آجاتا ہے، آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں کہ وہ اتنا موقع دیں کہ آپ ظہر کی نماز ادا کر سکیں[4]۔

نماز میں جس خضوع وخشوع کا حکم ہے، صحابۂ کرامؓ نے اس کے یہ نمونے پیش کئے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر ان کے اس روحانی ذوق وشوق میں مخل انداز ہوئی، تو انھوں نے اس کو اس ذوق پر نثار کر دیا، حضرت ابوطلحہ انصاریؓ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، ایک خوشنما چڑیا نے سامنے اڑنا شروع کیا، حضرت ابوطلحہؓ دیر تک ادھر اُدھر دیکھتے رہے، پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی، دل میں کہا اس باغ نے یہ فتنہ برپا کیا، یہ کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے

---

[1] صحیح بخاری و تذکرہ شہادت عمرؓ [2] موطا امام مالک کتاب الصلوۃ باب العمل فیمن غلب علیہ الدم [3] تذکرۂ علی طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۲۳۷، [4] تاریخ طبری کبیر ص ۲۲۷، جلد ۲، وقائع سنہ ۶۱ھ،

اور واقعہ بیان کیا، اور کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یہ باغ راہ خدا میں نذر ہے،

اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ میں نماز میں مشغول تھے، باغ اس وقت نہایت سرسبز وشاداب اور پھلوں سے لدا ہوا تھا، پھلوں کی طرف نظر اٹھ گئی تو نماز یاد نہ رہی، جب ان کو خیال آیا تو دل میں نادم ہوئے، کہ دنیا کے مال و دولت نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، یہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھ کو فتنہ میں مبتلا کر دیا راہ خدا میں دیتا ہوں، چنانچہ حضرت عثمانؓ نے بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار میں فروخت ہوا،[1]

[1] یہ دونوں واقعے موطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب النظر فی الصلوٰۃ الی ما یشغلک عنہا میں مذکور ہیں،

زکوٰۃ

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم

نماز کے بعد جس کا اصل تعلق خالق و مخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظم جماعت کا قیام ہے، اسلامی عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہمدردی اور باہم ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے اور جس سے نظام جماعت کے قیام کے لیے سرمایہ بہم پہنچتا ہے، زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے جس کا اطلاق تعمیم کے ساتھ ہر مالی و جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے لیکن فقہی اصطلاح میں "زکوٰۃ" صرف اس مالی امداد کو کہتے ہیں، جو ہر اس مسلمان پر واجب ہے، جو دولت کی ایک مقدار کا مالک ہے۔

زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں

زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے، جو تمام آسمانی مذہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے لیکن ان کے پیرووں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا کہ بظاہر ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا، مگر قرآن پاک کا دعویٰ ہے، اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز مذہب کا جزو لاینفک تھی، اسی طرح زکوٰۃ بھی

تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہیں، بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا اس میں نماز اور زکوۃ دونوں تھیں

أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ (بقرہ - ۱۰)	(ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار کرایا) کہ کھڑی رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوۃ
لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ، (مائدہ - ۳)	(اے بنی اسرائیل، اگر تم کھڑی رکھتے ہو نماز اور دیتے رہتے زکوۃ،

حضرت اسماعیلؑ کے ذکر میں ہے،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِسْمٰعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا (مریم ۴)	اور قرآن میں اسماعیل کا ذکر کر بیشک وہ وعدہ کا سچا تھا، اور وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر تھا، اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوۃ کی تاکید کرتا تھا، اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا،

حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں،

وَأَوْصَانِي بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا، (مریم ۲)	اور خدا نے مجھکو زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے کی تاکید کی،

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں یک عشر یعنی دسواں حصہ (احبار ۲۷-۳۰-۳۲) نیز ہر تیسرے برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر جو دو درہم ہوا غریبوں کو مستقل دینا جب تم کھیت (خروج ۳۰-۱۳-۱۵) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا

اور کھلیان کی منتشر بالیں اور انگور کے درختوں میں کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے، جو مال کی زکوٰۃ تھی اور یہ عشر ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی، یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کی جاتی تھی، اس کا ساتواں حصہ مذہبی عہدہ داروں کا تھا، دسواں حصہ حضرت ہارون کی اولاد (لاویین) قومی خاندانی کاہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی، اور تیسرے سال کا دسواں حصہ بیت المقدس کے حاجیوں کی مہمانی کے لئے رکھا جاتا تھا، اسی مد سے عام مسافروں، غریبوں، بیواؤں، اور یتیموں کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا[52]، اور نقد آدھے مثقال والی زکوٰۃ کی رقم جماعت کے خیمہ یا مسجد بیت المقدس، اور قربانی کے ظروف و آلات کی خریداری کے خرچ کے لئے رہتی تھی[53]

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شریعت محمدی کے ان ظاہری قواعد میں کوئی ترمیم نہیں کی بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا، انجیل لوقا (۱۸-۱۰) میں ہے کہ جو اپنی عشر و زکوٰۃ ریا نمائش اور فخر کے لئے دیتا ہے، اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے، اسی انجیل کے ۲۱ ویں باب کی پہلی آیت میں ہے:-

"اگر کوئی دولت مند ہیکل کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے، اور اس کے مقابلہ میں کوئی غریب بہ خلوص دل سے دو دمڑی ڈالے، تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولت مند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے"

ف نئے عہد نامہ میں یونانی لفظ کا ترجمہ عموماً خیرات ؛ Charity (بائبل اردو) میں خیرات"

[52] توراۃ: خروج ۳۰-۱۲، ۳۸-۲۶، [53] ایضاً،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ میں لٹا دے کہ (متی ۱۹-۲۴)

"اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گذر جانا آسان ہے، مگر دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے،

ساتھ ہی انھوں نے خود اپنی طرف سے نیز اپنے رفیق کی طرف سے اپنی ناداری کے باوجود آدھے مثقال والی زکوٰۃ ادا کی ہے، (متی ۱۷-۲۴)

توراۃ کے زمانہ میں چونکہ دولت زیادہ تر صرف زمین کی پیداوار اور جانوروں کے گلوں تک محدود تھی، اس لئے انہی دونوں چیزوں کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر آیا، سونا چاندی اور ان کے سکوں کی چونکہ قلت تھی، اس لئے اُن کی زکوٰۃ کا ذکر ایک ہی دو جگہ ہے، اسی بنا پر یہودیوں نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہیں کی، علاوہ بریں زکوٰۃ کی مدت کی تعیین کہ وہ ہر سال یا دوسرے یا تیسرے سال واجب الادا ہے، ٹھیک معلوم نہیں ہوتی نیز یہ کہ زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے یعنی وہ کہاں خرچ کیجائے، اس کی تفصیل بھی خود توراۃ کی زبان سے ہم کو سنائی دیتی ہے،

غرض وجوہ جو کچھ ہوں، مگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھلا دیا تھا، اور خصوصاً عرب میں جہاں کی دولت کے وہ تنہا مالک بن بیٹھے تھے، چند کے سوا اکثر اس فرض کا دھیان بھی نہ تھا، قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ

(اور تم نے ہم سے معاہدہ کیا کہ نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا)

وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ، پھر تم پھر گئے، مگر تم میں سے تھوڑے سے،

(بقرہ - ۱۰) تم دھیان نہیں دیتے،

عیسوی مذہب میں گو سب کچھ دینے کا حکم تھا مگر یہ حکم ہر ایک کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا، اور نہ ہر شخص اس پر عمل کر سکتا تھا، دوسرے مذہبوں میں بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنے کے احکام موجود تھے، مگر اُن کے لئے کوئی نظام اور اصول مقرر نہیں کیا گیا تھا، اور نہ ہر شخص پر قانوناً کوئی رقم واجب ہوتی تھی جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہو سکتا تھا،

اسلام کی اس بارے میں تکمیل

محمد رسول اللہ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کی شریعت نے اس بارے میں بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا، اُس نے نہایت خوبی اور دقتِ نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام بنایا، انسان کے مادی کاروبار کا معیار عموماً سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے، اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا، ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیئے، سونا چاندی، اور جانور پیداوار اور ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ شرحیں مقرر کیں، سونے چاندی میں چالیسواں حصہ اور پیداوار میں دسواں حصہ معین کیا، جانوروں کی مختلف قسموں میں اُن کی مختلف تعداد اور ان کی قدر و قیمت میں کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحیں قرار دیں، پھر زکوٰۃ کے ہر قسم کے مصارف کی تعیین و تحدید کی، اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا،

یہ تو اجمال تھا، اب تفصیلی حیثیت سے ان میں سے ہر ایک پہلو پر شریعتِ محمدی کی تکمیلی حیثیت کو نمایاں کرتا ہے،

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت

اسلام کی تعلیم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ وحی میں نماز
کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے، وہ زکوٰۃ ہے، نماز حقوق اللہ
میں سے ہے، اور زکوٰۃ حقوق عباد میں، ان دونوں فریضوں کا باہم لازم و ملزوم اور
مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد کا بھی
یکساں لحاظ رکھا گیا ہے، قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے، اس کے متصل ہی ہمیشہ
زکوٰۃ کا بھی بیان ہے، چنانچہ قرآن پاک میں بیس مقامات پر اقامت صلوٰۃ کے بعد ہی ایتاء زکوٰۃ کا
مثلاً اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ آتُوا الزَّکٰوۃَ یا اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ آتَوُا الزَّکٰوۃَ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت
یا اس کے دینے والوں کا تذکرہ اس کے علاوہ احادیث سے معلوم ہوگا کہ اسلام
میں زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے، بارگاہ نبوی میں اگر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کئے ہیں تو
ہمیشہ آپ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے، صحیحین کی کتاب الایمان میں متعدد حدیثیں
ہیں جن میں یہ ترتیب ملحوظ رہی ہے، بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کے شرائط بیعت میں داخل کی گئی ہے، چنانچہ
حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تو اس
پر کی تھی نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔ وفد عبد القیس نے دربار نبوی
کے آستانہ پر حاضر ہو کر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو آپ نے ان میں سے نماز کے بعد زکوٰۃ ہی کا

[۱] سنہ ۹ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن کا داعی بنا کر
بھیجا ہے، تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا جب

---

[۱] یہ دونوں حدیثیں صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص ۱۸۰ میں ہیں

یہ مان لیں تو ان کو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ان پر فرض ہے جب وہ نماز پڑھ لیں تو انھیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے دولتمندوں سے لیکر ان کے غریبوں کو دیجائے گی[1]

صحابہ میں جو لوگ شریعت کے راز داں تھے، وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی، اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے خلاف تلوار کھینچی، حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون روا نہیں، اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے، حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا "خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کریگا۔ میں اس سے لڑوں گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، خدا کی قسم جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں بکری کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا پڑے گا"[2] حقیقت میں یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو صرف شریعت کا محرم اسرار ہی سمجھ سکتا تھا، سب نے سمجھ، اور حقیقت کو سمجھا، اور سب نے اس کے سامنے اطاعت کی گردن جھکادی،

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے، اسلام کی اجتماعی زندگی صرف دو بنیادوں پر قائم ہے جن میں سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے، اسلام کا نظام روحانی

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجہمیہ [2] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص ۱۸۸، [3] در حقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے طرز عمل کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت تھی، فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ ... فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ (توبہ ۱) مشرکوں کو جہاں پاؤ ... مگر وہ توبہ کریں اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کو آزادی دیدو، نیز دیکھو صحیح بخاری جلد دوم ص ... باب کراہۃ الخلاف

نماز باجماعت سے جو کسی مسجد میں ادا ہو، قائم ہوتا ہے، اور اسی طرح زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال
میں جمع ہو کر تقسیم ہو، مرتب ہوتا ہے، اسی لئے یہ دونوں چیزیں اسلام میں ہمیشہ ساتھ ساتھ نظر
آتی ہیں، اور ان کی انفرادی حیثیت کے ساتھ ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعت
محمدی نے خاص زور دیا ہے، نماز جس طرح اور مسجد کے بغیر بھی ادا ہو جاتی ہے لیکن [illegible]
کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے، اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی
ادا ہو جاتی ہے، مگر اس کی فرضیت کے بعض اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہیں، یہی سبب ہے کہ حضرت
ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں جب بعض قبیلوں نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال میں داخل نہ کریں گے
بلکہ بطور خود اس کو صرف کر دیں گے، تو شریعت محمدیؐ کے شناساؤں نے ان کی اس تجویز
کو قبول نہیں کیا، اور بزور ان کو بیت المال میں زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا، کہ اگر ان کی یہ بات
تسلیم کر لی جاتی تو اسلام کی وحدت کا سر رشتہ اسی وقت ٹوٹ جاتا، اور مسلمانوں کی امت و
جماعت کا نظام اسی وقت درہم برہم ہو جاتا،

الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دستگیری،
مسافروں کی امداد، یتیموں کی خبرگیری، بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت
نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے، اور اس فریضہ کی یہ حیثیت ابتدا سے اسلام
کی تاریخ میں نظر آتی ہے،

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل

جس طرح اہم نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا، اور مدینہ آکر وہ درجہ
تکمیل کو پہونچی، اسی طرح زکوٰۃ یعنی صدقہ مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتدائے

تفصیلات کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا ہے،

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (مدثر-۱) — اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر،

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے، جو اس سورہ میں موجود ہے، اس کے بعد ہے،

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (مدثر-۱) — اور بدلہ بہت چاہنے کے لئے کسی پر احسان نہ کر،

یہی وہ بیج ہے جس سے مسائل زکوٰۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوئے، مدثر کے بعد سورۂ مزمل اتری، اس میں بتصریح دونوں حکم موجود ہیں، اور زکوٰۃ کی کسی قدر تفصیل بھی کی گئی ہے،

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ — اور نماز کھڑی کرو، اور زکوٰۃ دو،
وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا — اللہ کو قرض دو، اور جو کچھ آگے بھیجو گے
لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ — اپنے واسطے اس کو خدا کے پاس بہتر
اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا (مزمل) — ثواب میں زیادہ پاؤ گے،

بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفرؓ وغیرہ ہجرت کر کے حبش گئے ہیں، وہاں نجاشی نے دربار میں بلا کر ان سے اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات دریافت کی ہیں، تو حضرت جعفرؓ نے اس کے جواب میں جو تقریر کی ہے، اس میں بتایا ہے کہ اور وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، اور زکوٰۃ دیں[1] اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا حکم اس وقت تک نازل ہو چکا تھا، اور وفد عبدالقیس کے جو تقریباً سنہ ۵ھ میں آیا تھا، سوال کے جواب میں آپ نے جن احکام کی تعلیم دی، ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی[2]، سنہ ۵ھ میں جب نجاشی نے نامہ مبارکﷺ کے جواب میں سفیر

[1] مسند احمد جلد اول ص ۲۰۲ [2] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ،

کو نہیں سُنا، عتاب آیا،

فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ
وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ
(ماعون-۱)

وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا
ہے اور غریب کے کھلانے پر آمادہ
نہیں کرتا۔

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ
وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ
الْمِسْكِينِ، (فجر)

یہ بات نہیں، بلکہ بن باپ کے بچے کی
تم عزت نہیں کرتے، اور آپس میں
محتاج کے کھلانے کی تاکید نہیں کرتے

اور مسلمانوں کے اس باہمی ہمدردی، اور اُن کے جذبۂ ترحم کی تعریف فرمائی کہ

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ
مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا
إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ
لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا
شُكُورًا، (دھر-۱)

اور وہ (حاجتمند ہونے کے باوجود)
محتاج، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے
ہیں اور کہتے ہیں) کہ ہم تم کو صرف خدا
کے لئے کھلاتے ہیں، تم سے نہ بدلا چاہتے
ہیں اور نہ شکریہ،

مدینۂ منورہ میں جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا، اور انھوں نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا، تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا[1]، یعنی یہ کہ سال میں ایک دفعہ عید کے دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلہ خدا کی راہ میں خیرات کرے تاکہ غریب محتاج

۱؎ تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۲۸۱

تھی۔ یہی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گذارتے ہیں، اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام صورت سے تاکید کی گئی، انھوں نے دریافت کیا، یا رسول اللہ ہم کیا خیرات کریں

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ (بقرہ ۲۷) — وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں،

ارشاد ہوا،

قُلِ الْعَفْوَ۔ (بقرہ - ۲۷) — کہدو اے پیغمبر کہ تمھاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے اس کو خیرات کرو

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے، صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں خیرات کردیں، آیندہ کے لئے کچھ بچا نہ رکھیں کہ اس وقت عام مسلمانوں کی حالت اس کی مقتضی تھی، کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں، زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں، تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا:-

صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ و فتح الباری جلد ۳ ص ۲۱۲

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (بقرہ - ۳۷) — اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں، اور جو ہم تمھارے لئے زمین سے پیدا کریں اس میں سے کچھ خیرات کرو

مسلمانوں نے اس کی تعمیل کی، تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۔ اور ہم نے ان کو جو روزی دی ہے اس میں

(بقرہ ۔ ۱) سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہیں

صحابہ کو یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا، خدا کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لئے بیقرار رہتے تھے، چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے، تو غریب و نادار صحابہ نے آکر عرض کی کہ اے خدا کے رسول! جس کے پاس نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا، محنت مزدوری کرکے، اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فائدہ اٹھائے، اور دوسروں کو بھی صدقہ دے، انہوں نے پھر گذارش کی کہ جس میں اس کی بھی طاقت نہ ہو تو وہ کیا کرے، فرمایا ضرورت مند کی مدد کرے، انہوں نے پھر دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو؟ ارشاد ہوا تو وہ نیکی کا کام کرے، اور برائی سے بچے، یہی اس کا صدقہ ہے[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پیہم ترغیبات اور نصیحتوں کا صحابہ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لئے بازار جاکر بوجھ اٹھاتے تھے، اور اس سے جو کچھ ملتا تھا، اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے تھے،[2]

لیکن باایں ہمہ اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا، اس کا کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا، رمضان سنہ ۸ھ میں مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سررشتہ میں منسلک کردیا، اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا نظام مالیات قائم کرے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی،

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ۔ اے محمد! مسلمانوں کے مال میں سے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ ۔

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا ۔ صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اس کے ذریعہ

(توبہ-۱۳) سے تم ان کو پاک وصاف کر سکو۔

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام وقوانین مرتب ہوئے، اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں محصلوں اور عاملوں کا تقرر ہوا،[1] اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی، یہ تمام احکام وقوانین سورۂ برأت میں مذکور ہیں، جو ۹ھ کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین

اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعیین میں بڑی افراط وتفریط تھی، توراۃ میں جو عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا گیا تھا، وہ تین سال میں ایک دفعہ واجب ہوتا تھا (استثنا ۱۴-۲۸) اور انجیل میں کسی مدت اور زمانہ کی تعیین ہی نہ تھی، اس بنا پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اس کی مدت کا تعین تھا کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ میں واجب ہو کہ انسان بار بار کے دینے سے گھبرا جائے، اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اس کو ناگوار اور جبر معلوم ہو، اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبوں مسکینوں اور دوسرے حاجتمند لوگوں کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے طویل انتظار کی سخت تکلیف اٹھانی پڑے۔ اسلام نے اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے ہی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی، کیونکہ تمام متمدن دنیا نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے کاروبار کے لئے ۱۲ مہینوں کا سال مقرر کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ آفتاب کا عمل جو تمام زمین کی پیداوار اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلوں کی منفعتی

---

[1] ابن سعد جلد مغازی ص [illegible] و تاریخ طبری جلد ۳ ص ۱۷۲۲، مطبوعہ یورپ۔

جب محنت مفت ہاتھ آجاتی ہے اور بعض اوقات سخت محنت کرنی پڑتی ہے اسلئے سب کا یکساں حال نہیں ہو سکتا، انجیل نے حسب دستور اس مشکل کا کوئی حل نہیں کیا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کاملہ نے علم اقتصاد سیاسی (پولیٹیکل اکانمی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت کے فطری اور طبعی ذرائع کی تعیین کی، اور ہر ایک کے لئے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کردی،

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعت محمدی نے توراۃ کی قانونی تعیین اور انجیل کی اخلاقی عدم تعیین، دونوں حقیقتوں کو اپنے نظام میں جمع کرلیا، اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو اجازت دے دی، کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال یا کم و بیش جو چاہے خدا کی راہ میں دیدے۔ اس کا نام انفاق یا عام خیرات و صدقہ ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کردیا۔ کہ ہر شخص کی دولت میں غریبوں اور محتاجوں اور دوسرے نیک کاموں کے لئے بھی ایک مقرر و معلوم حصہ ہے، اور اس کا نام زکوٰۃ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا،

الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ	جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں، اور
وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ	جن کے مالوں میں مانگنے والے اور محروم
لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (معارج ۱)	کا معلوم حصہ ہے۔

اس آیت سے صاف اور صریح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانوں کی دولت میں غریبوں کا جو حصہ ہے وہ متعین، مقرر، معلوم اور محدود ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں معلوم و معلومات کے الفاظ جہاں آئے ہیں وہاں یہی مقصود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عربی میں جو رقم کسی

طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی، اس کی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی، اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کر لیا تھا۔ عرب میں اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے جس کا حکم توراۃ میں مذکور ہے، اور اس کی شرح بھی اس میں مقرر ہے یعنی پیداوار میں دسواں حصہ، اور نقدی میں نصف مثقال۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکمتِ ربانی سے اجناسِ زکوٰۃ پر مختلف شرحیں مقرر فرمائیں، جو قیمت کے لحاظ سے اسی شرحِ معلوم کے مساوی ہیں، اور ان شرحوں کو فرامین کی صورت میں لکھ کر اپنے عمال کے پاس بھجوایا، یہی تحریری فرامین تدوینِ حدیث کے زمانہ تک بعینہٖ محفوظ تھے، اور تدوینِ حدیث کے بعد ان کو بعینہٖ کتبِ حدیث میں درج کیا گیا، جو آج تک موجود ہیں۔

اس تمام تفصیل کا مخرج قرآن پاک میں بھی ایک حیثیت سے مذکور ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے، اس لئے اصول کا اقتضاء یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو، زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے، اور جیسے جیسے محنت بڑھتی اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے۔

عرب میں یہ دستور تھا کہ قبیلوں کے سردار چوتھا وصول کرتے تھے، اسی لئے وہ اپنے سرداروں کو مرباع (یعنی چوتھا والا) کہا کرتے تھے۔ شاید دوسری پرانی قوموں میں بھی یہ دستور ہو، ہندوستان میں مرہٹوں نے بھی چوتھ ہی کو رائج کیا تھا۔ مگر چونکہ اسلام کو محکوموں اور رعایا کے ساتھ زیادہ رعایت مدنظر تھی، اس لئے اس نے چار کو پانچ کر دیا، اس طرح چوتھائی کے بجائے دولت کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا، جس کو رسول اور ان کے بعد ان کے نائب

یعنی بیسواں حصہ (۲۰/۱) مقرر ہوا۔ نقدی سرمایہ جس کی ترقی، حفاظت، نشوونما، اور افزائش میں
انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے، اور جس کی افزائش کے لئے بڑے سرمایہ کی
ضرورت ہوتی ہے، اور جس میں ہر قدم پہ چوری، گم شدگی، لوٹ، اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے، زکوٰۃ
کی دوسری قسم کا بھی آدھا یعنی چالیسواں (۴۰/۱) حصہ مقرر ہوا۔[1] جانوروں کا ذکر آگے آتا ہے

زمینی پیداوار اور نقدی روپیہ پر شرح زکوٰۃ کی کمی و بیشی کی ایک دقیق فقہی علت
یہ بھی ہے کہ انسان کی اصلی ضرورت جس پر اس کا جینا منحصر ہے، صرف غلہ ہے۔ زمین کے اُگنے والی
چیز براہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہو جاتی ہے، اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ
بے پروا ہو جاتے ہیں لیکن سونے چاندی کے سکوں اور نقدوں کی جو دولت ہے، وہ براہ
راست اُن کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام نہیں آتی بلکہ وہ اس کو خرید و فروخت کے
ذریعہ سے واسطہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وہ کاشتکاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو
نقد روپیہ دیتے ہیں جس سے اُن کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ پھر وہ اس پیداوار
کو لے کر گاؤں گاؤں، شہر شہر اور ملک ملک پھرتے ہیں اور اتنی ہی اجرت [illegible] کرتے ہیں جتنی
محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے، اس سے بڑھ کر وہ مشقت ان کو
میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ سونا چاندی صدیوں کے خرچ اخراجات کے بعد کہیں پیدا ہوتی
ہے، اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے، اس سے سونے
چاندی کی قیمت کے معیار غلہ سے گراں تر ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینداروں کے

---

[1] یہ نکتہ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں بیان کیا ہے۔

اکہ عموماً دیہاتوں میں رہتے، اور شہروں سے دور ہوتے ہیں، نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکوں سے بھی محروم رہتے ہیں، اس لئے نسبتہً وہ قومی ضروریات، دین کی مالی خدمات اور مستحقین کی امداد میں اس اخلاق یعنی خیرات کی رغبت سے آزاد رہتے ہیں، جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک انجام دیا کرتے ہیں، اس بنا پر بھی سخت ضرورت تھی کہ ان کے لئے قانونی خیرات کی شرح اہل زمین سے مختلف رکھی جائے،

زکوٰۃ کی شرح مقدار کی تعیین میں اس خمس والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہے، خمس میں چونکہ ملت و حکومت کے تمام ذاتی و قومی مصارف شامل ہیں، اس لئے وہ کل کا خمس یعنی ۱/۵ مقرر ہوا، اور زکوٰۃ کے مصارف جیسا کہ سورۂ توبہ رکوع ۸ میں مذکور ہیں صرف آٹھ ہیں، اس بنا پر آٹھ مصارف کی شرح مقدار ۱/۵ کا ۱/۸ حصہ (یعنی ۱/۴۰) مقرر ہوا، یعنی سونا چاندی کی زکوٰۃ میں ان آٹھ مصرفوں کے لئے مجموعی رقم چالیسواں حصہ رکھی گئی، پھر غور کیجئے کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰۰ درہم یا اس کے مماثل سونا ہے، ان دو سو درہموں کو ۵ پر تقسیم کر دیجئے تو ۴۰ ہو جائے گا، یہ کل زکوٰۃ کی شرحیں ۱/۴۰ و ۱/۲۰ و ۱/۱۰ ایک دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ یہ تقسیم و تحدید حساب و اقتصادیات کے خاص خلوص پر مبنی ہے،

جانوروں پر زکوٰۃ تورات میں ہر قسم کے جانوروں میں دسواں حصہ زکوٰۃ کا تھا[1]، لیکن چونکہ ہر قسم کے جانوروں میں نسل کی افزائش کی صلاحیت اور مدت افزائش (زمانہ حمل) یکساں نہیں ہوتی

[1] احبار ۲۷، ۳۲،

نیز جانوروں میں دسویں بیسویں کا حصہ مشاع ہر تعداد پر چسپاں نہیں ہو سکتا، اس لئے ان میں
دسویں بیسویں کے بجائے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی، شریعت محمدیہ نے اس کو پورا
کیا، چنانچہ اسی پہلے اصول (پیدائش اور افزائش کی مدت، کیفیت، اور کمیت) کی بنا پر
اولاً بے نسل یا کم نسل کے جانوروں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا، خچر، گدھے (یا ہندوستان
میں ہاتھی) پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ دوسرے جانوروں کی مالیت اور قوت و کیفیت افزائش
کے لحاظ سے حسب ذیل شرح معین ہوئی، یہ وہ شرح نامہ ہے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے اپنی حکمت ربانی سے فیصلہ فرما کر دے کیا، اور زبانی نہیں، بلکہ تحریر کی صورت میں عمال
کو عنایت فرمایا تھا، اور خلفائے راشدین نے اسی کی نقلیں اپنے اپنے دور حکومت میں بھیجیں، اور
جس کی تعمیل آج تک بلا خلاف ہوتی آئی ہے۔

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	ایک سے چار تک	کچھ نہیں
"	۵ " ۹ "	ایک بکری
"	۱۰ " ۱۴ "	دو "
"	۱۵ " ۱۹ "	تین بکریاں
"	۲۰ " ۲۴ "	چار "
"	۲۵ " ۳۵ "	اونٹ کا ایک سال کا بچہ

۱؎ حنفیہ کے نزدیک خیل متناسلہ اور تجارت کے گھوڑوں میں زکوٰۃ ضروری اور باقی دوسرے گھوڑوں میں نہیں

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	۲۶ سے ۴۵ تک	اونٹ کا دوسالہ بچہ
"	۴۶ " ۶۰ "	تین سال کا اونٹ کا بچہ
"	۶۱ " ۷۵ "	چار سال کا اونٹ
"	۷۶ " ۹۰ "	دو سال کے دو بچے،
"	۹۱ " ۱۲۰ "	تین سال کے دو بچے،
"	۱۲۰ کے بعد ہر چالیس ۴۰ پر	دو سال کا ایک بچہ،
"	اور ہر پچاس ۵۰ پر	تین سال کا ایک بچہ
بکری	ایک سے ۳۹ تک	کچھ نہیں
"	۴۰ " ۱۲۰ "	ایک بکری
"	۱۲۱ " ۰۰ "	دو بکریاں،
"	۲۰۱ " ۳۰۰ "	تین بکریاں
"	پھر ہر سو ۱۰۰ پر	ایک ایک بکری
گائے بیل بھینس	ایک سے ۲۹ تک	کچھ نہیں،
"	۳۰	ایک دوسالہ بچھڑا[۱]
"	۴۰	تین سال کا [illegible]،

نوٹ [illegible] کا دوسرا سال شروع ہو ۲ جس کا تیسرا سال شروع ہوا

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
گائے، بیل، بھینس	۶۰	دو سال کے دو بچھڑے،
"	۷۰	ایک تین سال اور ایک دو سال کا
"	۸۰	تین سال کے دو
"	۹۰	" " " تین
"	۱۰۰	دو سال کے دو اور تین سال کا ایک

غرض حصول یہ ہے کہ ہر تیس بننے والے عدد پر ایک دو سالہ اور ہر چالیس بننے والے عدد پر ایک سہ سالہ،

نصاب مال کی تعیین شرح زکوٰۃ کے تعین کے سلسلہ میں شرائع سابقہ میں ایک اور کمی تھی جس کی تکمیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے کردی ہے، دوسری شریعتوں میں قانونی خیرات کی تعیین ہے، ان میں امیر و غریب اور کم و زیادہ دولت والوں کی تفریق نہیں کی گئی تھی، مثلاً اگر دس بیس روپے والوں یا دس پانچ گائے اور بکری والوں سے یہ زکوٰۃ وصول کی جاتی تو ان پر ظلم ہوتا اور تورات میں غلہ اور مویشی پر جو عشر اور نقد پر جو آدھی مثقال مقرر کیا گیا ہے اس میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ آدھے مثقال کی زکوٰۃ میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے

خداوند کے لئے نذر کرتے وقت آدھے مثقال سے امیر زیادہ نہ دے، اور غریب

کرنہ دے" (خروج ۳۰-۱۵)

لیکن شریعتِ محمدی نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا، اور غریبوں، ناداروں، مقروضوں، اور ان لوگوں کو جو سرمایہ نہیں رکھتے یا اپنی آزادی کے لئے سرمایہ جمع کر رہے ہیں، اس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا، نیز دولت کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی ان کی اپنی حسبِ خواہش، صدقہ خیرات کے سوا کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہیں کی، اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا، سونے کی زکوٰۃ کو بھی آدھا مثقال رکھا، لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مثقال اسی سے لیا جائیگا جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس[1] مثقال[2] سونے کا مالک ہو، اور ۵ اوقیہ یعنی ۲۰ مثقال سونے کی متوسط قیمت دو سو درہم چاندی کے سکے ہیں، یعنی ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے[3]، وہ کم سے کم معیارِ دولت جس پر زکوٰۃ نہیں حسب ذیل ہے،

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں،
غلہ اور پھل	پانچ وسق سے کم پر زکوٰۃ نہیں
اونٹ	پانچ عدد " " "
گائے، بیل، بھینس،	۳۰ " " " "
بھیڑ، بکری	۴۰ " " " "
سونا	پانچ اوقیہ (بیس مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہیں،

[1] موجودہ انگریزی [illegible] سے بیس مثقال سونا ساڑھے سات تولے، اور دو سو درہم چاندی [illegible] روپیہ کے برابر ہے،
[2] [illegible] زکوٰۃ [illegible]
[3] [illegible] وجہ ہے جس کو [illegible] ایک اونٹ [illegible]

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
چاندی	۲۰۰ درم سے کم پر زکوٰۃ نہیں

اس معیار سے امیر و غریب کی سطحوں میں جو یکساں زکوٰۃ کی ناہمواری تھی، وہ دور ہو گئی جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے، وہ اس قومی محصول سے بری ہو گئے۔

ان مذکورۂ بالا اشیاء کی تعداد جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے گو مختلف نظر آتی ہیں لیکن قیمت کے اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہیں، پانچ وسق غلہ، دو سو درم چاندی، اور پانچ اوقیہ سونا درحقیقت ایک ہی معیار ہے، ایک وقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا، چالیس درہم کے برابر ہے، اس بنا پر پانچ اوقیہ اور دو سو درم برابر ہیں، اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ میں چالیس درہم[1] یا ۴ مثقال تھی، یعنی پانچ اوقیہ اور پانچ وسق کی قیمت وہی دو سو درم یا ۲۰ مثقال ہوئی،

زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں اصلاحات

حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں تین قسم کی زکوٰۃ تھی، ایک آدھا مثقال سونے چاندی کی، یہ رقم جماعت کے خیمہ یعنی بیت المقدس کی تعمیر و مرمت اور قربانی کے طلائی و نقرئی ظروف و سامان کے بنانے میں خرچ کی جاتی تھی، (خروج ۳۰-۱۳) دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹتے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جا بجا کونوں اور گوشوں میں کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیئے جائیں جو غریبوں اور مسافروں کا حصہ تھا (احبار ۱۹-۹، ۱۰) سوم یہ تھی کہ ہر تیسرے سال کے بعد پیداوار اور جانوروں کا دسواں حصہ خدا کے نام پر نکالا جاتا، اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل و عیال کے بیت المقدس جا کر جشن منائے اور کچھ

---

[1] ہدایہ جلد اول باب زکوٰۃ فی التجارۃ۔

ادا کیا جائے، اور لاویوں میں جو موروثی کاہن اور خدا کے گھر کے خدمت گذار ہیں، تمام جنا تقسیم کیا جائے اور اس کے بدلے میں وہ خاندانی وراثت سے محروم رکھے گئے تھے) اس کے بعد یہ چیزیں بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کر دی جاتی تھیں کہ اُن سے مسافروں، یتیموں اور بیواؤں کو کھانا کھلایا جائے، (استثنا ۱۴۔ ۲۲۔ سے ۲۹ تک)

شریعتِ محمدیہ نے مذہب کی حقیقت میں سب سے بڑی جو اصلاح کی،

۱۔ وہ عبادت میں خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطوں کا حذف کرنا تھا، یہاں ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے، اس بنا پر مفت خور کاہنوں اور عبادتگاہوں کے خادموں کی ضرورت ساقط ہوگئی، اور اس لئے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قدیم مذہب کا رکن تھا، کلیۃً اڑ گیا،

۲۔ عبادت میں سادگی پیدا کرکے ظاہری رسموں اور نمائشوں سے اس کو پاک کر دیا گیا اس لئے سونے چاندی کے سامانوں، قربانی کے برتنوں اور محرابوں کے طلائی شمعدانوں کی ضرورت ہی نہیں رہی،

۳۔ حج ان ہی پر واجب کیا گیا، جن کے پاس زادِ راہ ہو، اس لئے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی، اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہوگئی۔

۴۔ زکوٰۃ کی چیز کو ملک کے ذاتی ضروریات اور مصارف میں صرف ہونے کی ممانعت کر دی گئی، اگر وہ ملک ہی کے ضروریات میں خرچ ہوگئی تو اس میں ایثار کیا ہوا،

۵۔ اس طرح وہ تمام سامان اور رقمیں جو ان مدوں سے بچ رہیں، غریبوں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ کو دے دی گئیں،

گذشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعت محمدیہ نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض اور اصلاحیں بھی کی ہیں، مثلاً

۶۔ شریعت سابقہ میں ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہیں کی جاتی تھی، بلکہ ذخیرہ میں جمع ہو کر اس کا کچھ ایک گروہ باہم تقسیم ہوتا تھا، لیکن چونکہ انسانی ضروریات صرف کھانے تک محدود نہیں ہیں، اس لئے شریعت محمدیہ نے اس رسم میں یہ اصلاح کی کہ یہ رقم خود مستحقین کو دیدی جائے، تاکہ وہ جس طرح چاہیں، اپنی ضروریات میں صرف کریں۔

۷۔ ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدھے مثقال والی تھی، وہ بیت المقدس کے خرچ کے لئے مخصوص تھی، اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی، شریعت محمدیہ نے بیس مثقال پر آدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرض کرکے اس کو بھی تمام تر مستحقین کے ہاتھوں میں دیدیا

۸۔ غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کا سارا بیت المقدس میں جاتا تھا، اور وہیں سے وہ بٹوا کر تقسیم کیا جاتا تھا، یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید ہو سکتا ہو مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم میں منتشر پیرؤوں کے لئے یہ بالکل ناکافی تھا، اس لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اسی مقام کے مستحقین میں صرف کی جائے۔

۹۔ بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤں کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی ادائیگی کرتے تھے، جب تک ان کو امداد ملتی رہتی، خوش اور مطمئن رہتے، اور جب نہ ملتی تو اعتراض کرنے لگتے، اسلام نے ایسے لوگوں کا منہ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادت بدلنے کی غرض سے زکوٰۃ کے جائز مصارف کی تعیین کردی، اور بتادیا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہیں، اور اس رقم کے

کس کس کو دی جا سکتی ہے، چنانچہ سورۂ توبہ کے ساتویں رکوع میں اس کا مفصّل ذکر ہے،

۱۰۔ اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کی جاتی، اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتا دیئے جاتے، تو یہ تمام سرمایہ خلفاء اور سلاطین کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہتا، اور سلطنت کی دوسری آمدنیوں کی طرح یہ بھی اُن کے عیش و عشرت کے پرتکلّف سامانوں کی نذر ہو جاتا، اس لئے تاکید کر دی گئی کہ جو غیر مستحق اس کو لے گا، اس کے لئے یہ حرام ہے، اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ تا بامکان اب تک صحیح مصارف میں خرچ ہوتی ہے،

۱۱۔ اس قسم کی مالی رقم جب کوئی اپنے پیرووں پر عائد کرتا ہے، تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہو سکتی ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے، حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارونؑ اور ان کی اولاد (بنو لاوی) کو ٹھہرایا گیا تھا کہ وہ خاندانی کاہن مقرر ہوئے تھے، مگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس قسم کی بدگمانیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، اور اپنے خاندان کے لئے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر قسم قطعی طور پر حرام کر دی گئی،

۱۲۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دئیے گئے،

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ	زکوٰۃ کا مال تو غریبوں، مسکینوں، (۱)
الْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا	زکوٰۃ کے صیغہ میں کام کرنے والوں (۲)
وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي	ان لوگوں کے لئے ہے، جن کے دلوں

الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۞

(توبہ ۔ ۶۰)

کو اسلام کی طرف لانا ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں ان میں اور خدا کی راہ میں اور مسافر کے بارہ میں یہ خدا کی طرف سے ٹھہرایا ہوا ہے اور خدا علیم و حکمت والا ہے اس لئے اس کی یہ تقسیم علم و حکمت پر مبنی ہے۔

فقراء میں ان خوددار اور مستور الحال شرفاء کو ترجیح دی ہے، جو دین اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا پیشہ نہیں کر سکتے، اور حاجتمند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے، اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں، چنانچہ فرمایا:-

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۞

(بقرہ ۔ ۳۷)

ان مفلسوں کو دینا جو اللہ کی راہ میں رکے ہوئے ہیں، اور زمین میں (روزی حاصل کرنے کے لئے) چل پھر نہیں سکتے، ناواقف اُن کے نہ مانگنے کی وجہ سے اُن کو بے احتیاج سمجھتے ہیں، تم ان کو اُن کے چہرے سے پہچانتے ہو کہ وہ حاجتمند ہیں، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔

تمام مستحقین کو درجہ بدرجہ اُن کی اہمیت اور اپنے تعلق کے لحاظ سے دینا چاہئے، چنانچہ اسی سورہ میں فرمایا،

وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي	اور جس نے خدا کی محبت پر (یا مال
الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ	کی محبت کے باوجود) قرابت داروں
وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ	یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے
وَفِي الرِّقَابِ ۝	والوں، اور غلاموں یا مقروضوں
(بقرہ - ۲۲)	کی گردن چھڑانے میں مال دیا،

اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے،

قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ	کہو جو تم مال خرچ کرو، وہ اپنے
فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ	ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَ	مسکینوں اور مسافر کے لئے۔
ابْنِ السَّبِيلِ ۔ (بقرہ-۲۲)	

دو ضرورتمندوں میں ترجیح

اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرابت مند اور رشتہ داروں کے دینے سے اجنبی، بیگانہ اور بے تعلق لوگوں کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی کہ اپنے لوگوں کے دینے میں کچھ نہ کچھ نفسانیت کا ایک حیثیت سے خود غرضی کا شائبہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہیں اور ان کا نفع و نقصان اپنا ہی نفع و نقصان ہے لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی مغالطہ اور فریب تھا، ایک انسان

پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہیں، وہ تمامتر تعلقات کی کمی وبیشی پر مبنی ہیں جو جتنا قریبی
اتنا ہی زیادہ آپ کے حقوق اس پر اور اس کے حقوق آپ پر ہیں، اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری اور
قرابتمندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہو جائیں، انسان پر سب سے پہلے حق اپنا ہے
پھر اہل وعیال کا ہے، ان کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سامان میں کچھ بچ رہے، تو اس میں
حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قرابتدار ہیں چنانچہ وراثت و ترکہ کی تقسیم میں اسی اصول کی
رعایت کی گئی ہے،

یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابتداروں کو ترجیح دیجائے، تو دوسرے غریبوں کا حق کون دے گا یہ
ایک قسم کا مغالطہ ہے، دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے اس بنا پر اگر ہر شخص اپنے
رشتہ داروں کی خبرگیری کرے، تو کل انسانوں کی خبرگیری ہو جائے گی، اس کے علاوہ اس
مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے جس کو دور ہو جانا چاہئے مستحقین میں باہم ایک کو دوسرے
پر جو فوقیت ہے اس کا مدار دو چیزوں پر ہے، ایک تو دینے والوں سے ان شخصوں کے قرب وبعد
کی نسبت، دوسرے ان شخصوں کی حاجتوں اور ضرورتوں کی کمی وبیشی قرابتمندوں کی ترجیح کے
یہ معنی نہیں ہیں کہ خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی کم اور معمولی ہو، ان کو ان لوگوں پر ترجیح ہو جن کی
ضرورت و حاجتمندی ان سے کہیں زیادہ ہو، بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر دو شخص برابر کے حاجتمند
ہوں اور ان میں ایک آپ کا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی مدد کا زیادہ مستحق ہوگا یعنی ضرورت
و حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی وبیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی، اور یہی سبب ہے
یہ انسان کی فطرت ہے کہ ایسی حالت میں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ترجیح دے،

فقرا اور مساکین میں سے ان لوگوں پر جو بے حیائی کے ساتھ در بدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں، ان کو ترجیح دی گئی ہے، جو فقر و فاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہیں، لیکن اپنی عزت و آبرو اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں، یہ تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، آپ نے فرمایا مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک دو لقمے در بدر پھرایا کرتے ہیں، صحابہ نے دریافت کیا، پھر کون مسکین ہے، ارشاد ہوا وہ جس کو حاجت ہے، لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا، اور وہ کسی سے مانگتا نہیں[1]۔"

اس تعلیم کے دو مقصد ہیں، ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والوں کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دیگا، ورنہ کہیں نہ کہیں سے پا ہی جائیں گے، اس لئے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہیں، لیکن توجہ ان مستور حال مسکینوں کی طرف ہونی چاہئے، جو صبر و قناعت کے ساتھ فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں کہ ان کی خبر بہتوں کو نہیں ہو سکتی، اور اکثر وہ امداد سے محروم رہ جاتے ہیں، دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم و عمل سے یہ ثابت کر دے کہ بے حیا گداگروں کی عزت اس کی نگاہ میں نہایت کم ہے، اور وہ ہر حال میں اس بے حیائی کو ناپسند کرتی ہے، شریعت نے مصارف زکوٰۃ کی تعیین و تحدید اس غرض سے بھی کی ہے، کہ ہر شخص کو مانگنے کی ہمت نہ ہو، اور ہر شخص اس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے، جیسا کہ بعض منافقین اول اول زکوٰۃ کو اپنے لئے آمدنی کا ذریعہ سمجھ رکھا تھا، چنانچہ وحی الٰہی

---

[1] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب المسکین الذی لا یجد غنی ولا یفطن لہ۔

ان کی پردہ دری ان الفاظ میں کی،

وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ
فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ
لَمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ
وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ
وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ
سَيُؤْتِينَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ وَ
رَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللّٰهِ رَاغِبُونَ
إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَ
الْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا
وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ
وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ
وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ
اللّٰهِ ط

(توبہ - ٧، ٥٨)

اور بعضے ان میں سے ایسے ہیں، جو تجھ کو
(پیغمبر کو) زکوٰۃ بانٹنے میں طعن دیتے
ہیں، اگر ان کو اس میں سے ملے تو راضی
ہوں، اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش ہوجائیں
اور کیا خوب تھا، اگر وہ اس پر راضی
رہتے، جو خدا اور اس کے رسول نے
ان کو دیا، اور کہتے کہ ہم کو اللہ بس ہے
ہم کو اللہ اپنی مہربانی سے اور اس کا
رسول دے رہیں گے، ہم کو تو خدا ہی
چاہیے، زکوٰۃ تو حق ہے، غریبوں کا،
مسکینوں کا، اور اس کا کام کرنے
والوں کا، اور اُن کا جن کا دل
(اسلام کی طرف) پرچانا ہے، اور
گردن چھڑانے میں، اور خدا کی راہ
میں، اور مسافر میں، یہ حصے خدا کی طرف
سے بھرائے ہوئے ہیں،

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ مانگنے کی

درخواست کی، آپ نے فرمایا: "اے شخص! اللہ تعالیٰ نے مالِ زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی نبی کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اور اس کے آٹھ مصرف بیان کر دیئے ہیں، اگر تم اُن آٹھ میں ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں[1]"

زکوٰۃ کے مصارفِ ہشتگانہ

یہ آٹھوں مصارف نیکی، بھلائی، اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں۔ فقراء اور مساکین میں وہ تمام اہلِ حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، جیسے بڈھے، لولے، لنگڑے، مفلوج، کوڑھی، یا وہ محنت کر سکتے ہیں، لیکن موجودہ حالت میں دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے، جیسے مبلغین، مذہبی معلمین، طالبانِ علم (لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ) میں بھی یہی داخل ہیں اور اسی بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانۂ مبارک میں اصحابِ صفہ داخل تھے، اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں، جو اپنی پوری محنت و کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے بالکل قاصر ہیں، اور فاقہ کرتے ہیں۔

وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا (یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی وصول تحصیل کا کام کرنے والے) کی تنخواہ اسی سے، پھر کوئی اجرت یہ ہے۔ وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ (جن کی تالیفِ قلوب کی جائے) میں وہ لوگ داخل ہیں جن کے اندر اسلام کی محبت پیدا کرنا ہو، یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہو۔ وَفِي الرِّقَابِ (گردنوں کے چھڑانے میں) اس سے مقصود وہ غلام ہیں جن کی گردنیں دوسروں

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی من الصدقۃ وحد الغنی۔

کے قبضہ میں ہیں اور اُن کو خرید کر آزاد کرنا ہے، اور وہ مقروض ہیں جو اپنا قرض آپ کسی طرح ادا نہیں کرسکتے وَالْغَارِمِينَ (تاوان اٹھانے والوں) سے مراد وہ نیک لوگ ہیں جنھوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصالحت کرانے کے لیے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کی جاسکتی ہے۔ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم ہے، جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے[1] اور حسب ضرورت کبھی اس سے مذہبی لڑائی یا سفر حج ہیا اور دوسرے نیک کام مراد لئے جاسکتے ہیں، اور وَابْنِ السَّبِيلِ (مسافر) میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافروں کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً راستوں کی درستی، پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر بھی داخل ہوسکتی ہے[2] یہ ہیں زکوٰۃ کے دو آٹھ مقررہ مصارف جن میں اسلام نے اس قومی و مذہبی رقم کو خرچ کرنے کی تاکید کی ہے،

مسکینوں فقیروں اور معذوروں کی امداد

زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لنگڑے، لولے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی، مفلوج، اور دوسرے معذور لوگوں کی امداد کی جائے، نادار یتیموں، بیواؤں، اور ان لوگوں کی خبرگیری کی جائے جو اپنی کوشش اور جد وجہد کے باوجود روزی کا سامان

---

[1] بعض مترجموں نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے، مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی، جس آیت کا ترجمہ کیا ہے اسی کے بعد ہے لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، یہاں فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر قسم کے دینی کام مراد ہیں، گو فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے مگر ان کا استدلال جو لِلْفُقَرَاءِ کے لام تملیک پر مبنی ہے، بہت کچھ مشتبہ ہو سکتا ہے، کہ لام نفع کا بھی ہوتا ہے جیسے خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ [2] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف، باب الصدقات

صحرا و بیابان، جنگل، اور میدان آبادی اور ویرانی، ہر جگہ آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا
تھا، اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے۔ یہ وہ ہیں جو اپنے اہل و عیال، عزیز و قریب، دوست
احباب، مال و دولت سے الگ ہو کر اتفاقات و حوادث کی بدولت بہہ کر کہاں سے کہاں
نکل جاتے ہیں۔ ان کے پاس کھانے کے لئے کھانا، پینے کے لئے پانی، سونے کے لئے بستر و
اوڑھنے کے لئے چادر نہیں ہوتی، اور یہ حالت ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت پیش آ جاتی ہے، اس لئے
ضرورت تھی کہ اُن کے آرام و آسائش کا سامان کیا جائے۔ اسی اصول پر سرائیں، لنگر یا
مسافر خانے پہلے بھی بنوائے جاتے تھے، اور اب بھی بنوائے جاتے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب اس اسٹیم اور بجلی کے عہد میں یہ تمام مشکلیں افسانۂ کہن و
داستانِ پارینہ ہو گئی ہیں، اب ہر جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریاں، بڑے بڑے
بینک اور آمد و رفت کا سامان کرنے والی کمپنیاں قائم ہو گئی ہیں، اور سفر و حضر میں کوئی دقت نہیں
رہا ہے، مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے، یہ صرف دولتمندوں اور سرمایہ داروں کی
راحت و آسائش کے لئے ہوا ہے، اور اُن کے ان نئے طریقوں نے پرانے طریقوں کے پرانے آثار کو
حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے، آج متمدن دنیا کے بڑے سے بڑے پر رونق شہروں سے لے کر معمولی
دیہاتوں تک میں جہاں امیر اور دولتمند مسافروں کے لئے قدم قدم پر ہوٹل، ریسٹوران، قہوہ خانے
اور آرام خانے موجود ہیں، وہاں اس پورے مسیحی ملک میں حضرت مسیح کی طرح ایک غریب مسافر
کے لئے کہیں سر رکھنے کی جگہ نہیں، کسی کی جیب میں جب تک کسی بینک کا نوٹ درج نہیں، اس کے
لئے ہوٹلوں اور اقامت خانوں کے تمام دروازے بند ہیں، کیا یہ انسانیت کے لئے رحمت ہے؟

کیا یہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ہے؟ لیکن تمام ملکوں کے طول وعرض میں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے قبضہ میں آئے، سراؤں، مسافرخانوں، کنووں اور مہمان خانوں کا وہ وسیع سلسلہ قائم ہو گیا کہ ایک غریب مسلمان اسپین کے کنارہ سے چل کر کاشغر کے ایک گاؤں میں بآرام و آسائش پہونچ جاتا تھا اور ہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے تک اَھْلاً بِاَھْلٍ وَاَوْطَاناً بِاَوْطَانٍ کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا تھا۔ اور آج بھی اس نظام کی بدولت ان اسلامی ملکوں میں جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طریق سے واقف نہیں ہیں، غریب مسافروں کو وہی آرام و آسائش حاصل ہے اور امرا اور دولتمندوں کے لئے کیا کہنا۔ ایک جہاں گرد سیاح بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق

منعم بکوہ و دشت و بیابان غریب نیست　　　　ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

جماعتی کاموں کی ضروریات کی صورت

جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ میں نہیں بندھ جاتے، حقیقت میں جماعت کا وجود نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ فرد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہیں۔ جماعت کے کمزوروں، معذوروں اور مفلسوں کی مدد، جماعت اور اس کے اصول کی حفاظت کے لئے سرفروشانہ مجاہدہ کی ضرورت، اس کے اخراجات کی کفالت، جماعت کی اندرونی تجارت اور صنعت کے وسائل کی ترقی و میزان تجارت کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والوں اور مقروضوں کی امداد کرنا، جماعت کے اندر کے نیز کو مبلغ و صرف دینا، نوجوانان ملت کی مذہبی اور تعلیمی خدمات بجا لانا، اور ہر قسم کی فرائض انتظام و نسق کے فرائض انجام دینا، ان کے واسطے جماعت کا سرمایہ دولت ہی

کا سبب تو خدا سے خوف و رجا اور تعلق و محبت کا نہ ہونا ہے، اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے لیکن دوسرا سبب ماسوی اللہ کی محبت اور مال و دولت اور دیگر اسبابِ دنیا سے دل کا تعلق، زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے، غزوۂ تبوک کے موقع پر جب صحابہؓ سے باغ و بستان کی محبت کے سبب سے جو ان کی دولت تھی، غزوہ میں عدمِ شرکت کا جرم ثابت ہوا ہے، اور پھر ان کی صداقت اور سچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا ہے، وہاں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خطاب کرکے قرآن پاک میں ارشاد ہے،

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً	اُن کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر اُن کو
تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (توبہ)	پاک و صاف بنا،

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبتِ مال ہے، دل سے دور ہو جاتا ہے، نفس کی بیماری کا اس سے علاج ہو جاتا ہے، مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے، دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے، شخصی خود غرضی کے بجائے جماعتی اغراض کے لئے اپنے فائدہ نثار کرنا انسان سیکھتا ہے، اور یہی وہ دو باتیں ہیں جن پر تہذیبِ نفس اور حسنِ خلق کی عمارت تمام اور جماعتی زندگی کا نظام مبنی ہے،

قرآن مجید میں سود اور صدقہ میں جو حد فاصل قرار دی گئی ہے، وہ یہ ہے،

يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ	خدا سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو
(بقرہ-۳۸)	بڑھاتا ہے،

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت سود میں نقصان اور صدقہ کے اس میں اضافہ ہو،
کیونکہ مشاہدہ بالکل برعکس ہے، بلکہ اُخروی ثواب وگناہ اور برکت و بےبرکتی کے فرق کے علاوہ
اصلی مقصد اس سے یہ ہو کہ سود گو شخصی دولت میں اضافہ کرتا ہے لیکن جماعتی دولت کو برباد
کر دیتا ہے جس سے پوری قوم مفلس ہو جاتی ہے، اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہو جاتا ہے، اور زکوٰۃ،
صدقہ وخیرات سے قوم کے نادار افراد کی مدد ہو کر قومی دولت کا معتدل انتظام رہتا ہے، اور
ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے اگر سود لینے والا کبھی اتفاق سے نادار
ہو جاتا ہے تو اس کی مدد کے لئے جماعت ایک انگلی تک نہیں ہلاتی لیکن صدقہ دینے والے کی مدد
کے لئے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے،

ایک اور بات یہ ہے کہ سودخور اس قدر حریص اور طامع ہو جاتے ہیں کہ ان کو دولت کی کثیر
مقدار بھی کم نظر آتی ہے، اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے خوگر ہوتے ہیں، وہ اس قدر مستغنی
اور قانع ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے، سودخور اپنے مال کے نفع
اور ترقی کی دھن میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ بسا اوقات دوسروں کو قتل کر کے ان کی دولت
پر قبضہ کرتا ہے آخر اسی طور سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اصل و منافع پر یک دفعہ
قبضہ کر لیتا ہے لیکن صدقہ وخیرات دینے والا جو دوسروں کی دولت ناجائز طریق سے
نہیں لوٹتا، بلکہ خود دوسروں کو اپنے مال سے دیتا ہے، وہ سلامت روی کے ساتھ
اپنے کاروبار کو چلاتا ہے، اس کو کوئی دوسرا بھی نہیں لوٹتا، وہ اپنے سرمایہ اور
قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہروں کی منڈیاں

تسلی اور تسکین کے لئے دوسری دنیا کی توقع اور امید کے بڑے بڑے خوش آیند افسانے سنائے گئے ہیں لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس دنیا کی زندگی کی یہ تلخی محض اہل مذہب کی تعبیر ہی کا سرود نہیں ہے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا کے پہلے اور وہی تنہا پیغمبر ہیں جنہوں نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا، اور اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کے لئے تدبیر جاری اور نافذ فرمائی، خود اپنی زندگی غریبوں اور مسکینوں کی صورت سے بسر کی، اور دعا فرمائی کہ خداوندا مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر کر، آپ کے گھر کا چبوترہ (صفہ) غریبوں اور مسکینوں کی پناہ کا سایہ تھا، وہی آپ کی بزم قدس کے مقرب درباری اور اسلام کے معرکوں کے مخلص جانباز تھے، آپ کی نظر میں کسی انسان کی عزت اور ننگ دستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی، اور نہ دولت وامارت عزت و وقار کے مرادف تھی، بلکہ صرف نیکی اور پرہیزگاری فضیلت اور بزرگی کا حقیقی معیار تھی، حضرت مسیح نے فرمایا کہ "مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، کیونکہ آسمان کی بادشاہت انہی کی ہے" آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سے زیادہ اختصار و ایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا۔

إِنَّ الْمُكْثِرِينَ هُمُ — جو دولت مند ہیں، وہی

الْمُقَلُّونَ ۲؎ — غریب ہیں،

اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جو غریب ہیں وہی دولت مند ہوں گے۔

۱؎ ترمذی ۔ ۲؎ صحیح بخاری کتاب الرقاق باب المکثرون هم المقلون۔

پھر یہ خوشخبری دی کہ غریب (جن کو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہیں دینا ہے) دولت والوں سے ۴۰ سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔[1]

اسلام نے ان روحانی تسلیوں اور بشارتوں کے ساتھ جو مزید کام کیا، وہ ان کی دنیاوی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کی عملی تدبیریں ہیں، جن کا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے، اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب و تشویق تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کیلئے دو قسم کی تدبیریں اختیار کیں، ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی جس سے جتنا ہو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے، یہ اخلاقی خیرات ہے جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں انفاق ہے، لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہیں کرتی، اس لئے ایک مقدار معین کے مالک پر ایک سالانہ قانونی محصول عائد کیا جس کا سالانہ ادا کرنا اس کا مذہبی فرض ہے، اور اس مجموعی رقم کا ایک حصہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد و اعانت کے لئے مخصوص کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تنظیم کو ایک ذاتی خیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کیلئے سپرد فرمایا، چنانچہ آپ نے معاذ بن جبلؓ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا، تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہے، پھر اس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ

تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ[2] — وہ ان کے دولتمندوں سے لیکر ان کے غریبوں کو لوٹا دیا جائے۔

---

[1] جامع ترمذی کتاب الزہد باب ما جاء ان فقراء المہاجرین یدخلون الجنة قبل اغنیائہم۔ [2] صحیح بخاری جلد دوم ص، وکتاب الرد علی الجہمیہ۔

اور اس پابندی کے ساتھ عمل نہ ہو سکتا، اور آج بھی مسلمانوں کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہے، اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمانوں میں اگرچہ امیر کم ہیں تو ویسے غریب و محتاج بھی کم ہیں، جیسے دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں، تاہم افسوس ہو کہ ایک مدت سے مسلمانوں کا یہ نظام سخت ابتری کی حالت میں ہے، اور اس کی طرف سے غفلت برتی جا رہی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا بیت المال منتشر و پراگندہ ہے،

دولتمندی کی بےجا تحقیر

دولتمندی اور تمول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب میں ایک معرکۃ الآرا بحث کی حیثیت سے چلا آرہا تھا، یہودیت کی طرح بعض ایسے مذہب ہیں جن میں نہ تو دولتمندی کی کوئی تحقیر کی گئی، اور نہ مفلسی اور غربت کو سراہا گیا، ہر جگہ یا اس بحث کو بالکل چھوڑ دیا گیا، لیکن عیسائیت اور بودھ مت وہ ایسے مذہب ہیں جن میں دولت کی پوری تحقیر کی گئی ہے، عیسائیت کی نظر میں دولتمندی اور تمول نجات کی راہ کا کانٹا ہے، کیونکہ کوئی انسان اس وقت تک نجات نہیں پا سکتا جب تک وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے خدا کی راہ میں نہ دے، انجیل میں ہے کہ ایک نیکوکار دولتمند نے حضرت عیسیٰؑ سے نجات کا طریقہ دریافت کیا، تو جواب میں فرمایا:-

"اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے، بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا، تب آکے میرے پیچھے ہو لے"

وہ دولتمند یہ تعلیم سن کر غمگین ہو کر چلا گیا، تب انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا،

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولتمند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے"

بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گذر جانا اس سے آسان ہے کہ

دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو (متی ۱۹-۲۰-۲۴)

بودھ مت نے نیک لوگوں کو ترک دنیا کی تلقین کی ہے اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی ہدایت کی ہے، اور ایسے لوگوں کے لئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہوں تو بھیک کا پیالہ لے کر لوگوں کے دروازوں پر کھڑے ہوں۔ مگر ہمارے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں طریقوں کو ناپسند فرمایا۔ اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بری چیز ہے تو اس برائی کو دوسروں کی طرف منتقل کر دینا اُن کی خیرخواہی نہ ہوئی، دشمنی ہوئی۔ اور اگر غربت کوئی بری چیز ہے تو سب کچھ دوسروں کو دے کر خود اسی حال میں بن جانا کہاں کی دانشمندی اور انصاف ہے اس لئے یہ طریقہ ہر شخص کے لئے یکساں مفید نہیں ہے۔ نہ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفسِ غربت شیطان کو فرشتہ بناتی ہے، جس طرح دولت مندی دنیا میں ہزاروں گناہوں کی محرک ہے اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزاروں جرائم کا باعث ہے۔ اور ان دونوں طبقوں سے انسانوں کا بچانا ایک نبوتِ عظمیٰ کا فرض تھا۔ دولت بحیثیت دولت، اور غربت بحیثیت غربت نیک و بد، اور خیر و شر دونوں صفتوں سے پاک ہے۔ بلکہ نیکی کرنے کی اصل حیثیت اور اہمیت کے لحاظ سے دیکھی جائے تو ایک نیکوکار دولت مند، ایک نیکوکار غریب سے بڑھ کر نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے۔ اسی لئے دولت اسلام کی نگاہ میں خدا کی ایک نعمت ہے، لعنت نہیں، ہنر ہے، عیب نہیں، خیر ہے، شر نہیں، چنانچہ قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر دولت کو "خیر" اور "فضل" سے تعبیر کیا گیا ہے اور احادیث میں بھی دولت کی فضیلت

کیونکر ہو سکتی ہے، آپ نے سوال سُن کر ذرا تامل کیا، پھر پیشانی سے پسینہ کے قطرے پونچھ کر فرمایا:
بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے
جس کو موسم بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہو، جب بعض جانور حرص و طمع میں آکر حد
سے زیادہ کھا لیتے ہیں، تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز اُن کی ہلاکت اور موت کا باعث
بن جاتی ہے، لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے، جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے
تو وہ دھوپ کے سامنے ہو جاتا ہے، اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے، فضلہ باہر پھینک دیتا ہے اور پھر
چرنے لگتا ہے، دولت ایک خوشگوار چیز ہے، تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو
یہ دولت اس کے لئے بہترین مددگار ہے، لیکن جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہیں کرتا اس
کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے، اور سیر نہیں ہوتا۔[۱]

اس تقریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرما دیا اور بتا دیا کہ نفس
دولت خیر و شر نہیں ہے بلکہ اس کی درست و نادرست طریقہ حصول اور جائز و ناجائز مصرف
خیر و شر ہے، اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کی جائے، اور صحیح طریقہ سے خرچ کی جائے تو وہ نیکیوں
اور بھلائیوں کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے، اور اگر اس کے حصول و صرف کا طریقہ صحیح نہیں تو وہ بری
شر انگیز ہے، اخلاقی محاسن و معائب میں غریب و امیر دونوں کے لئے یکساں ہیں، ایک سخی و فیاض مستطیع
امیر اور ایک قناعت پسند اور صابر و شاکر غریب اسلام کی نظر میں فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہیں
اسی طرح ایک متکبر بخیل، اور خوشامدی اور لالچی فقیر پستی کی ایک ہی سطح پر ہیں ... ضرورت کی

۱؎ صحیح بخاری کتاب الزکوۃ و کتاب الزہد و الرقاق باب ما یحذر من زہرۃ الدنیا۔

اور وہ اس کے مطابق شب و روز عمل کرتا ہے، اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی اور
اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں
گاڑ کر رکھتے ہیں، اور کار خیر میں خرچ نہ کرتے ہوں، ان کو خطاب کیا،

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَ	وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر
الْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ	رکھتے ہیں، اور اس کو خدا کی راہ میں
اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ	خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک
(توبہ - ۵)	کی بشارت دیدو،

اس آیت پاک نے صحابہ میں دو فریق پیدا کر دیئے، ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ہو سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا چاہیئے، کل کے لئے کچھ نہ رکھنا چاہیئے، ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت میں عذاب کا مستحق ہوگا، دوسرا کہتا تھا، خدا نے ہماری دولت میں جو حق واجب ٹھہرایا ہے، یعنی زکوٰۃ، اس کے ادا کرنے کے بعد، اس کا جمع کرنا عذاب کا موجب نہیں لیکن جلیل القدر صحابہ اور علمائے امت نے اپنے قول و عمل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھول دی،
حضرت موسیٰ کی توراۃ میں مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تاکید نہیں، حضرت عیسیٰ کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنجیاں اسی کے حوالہ کی گئی ہیں، جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے، یہ دونوں تعلیمیں اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہیں لیکن جس طرح پہلی تعلیم عالی بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلہ کو کم کرتی، اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بلند روحانی تخیل ہے، ہر [illegible]

---

۱ بخاری کتاب العلم باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ،

انسانوں کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے، اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ یک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے، اور اسی لئے بہت کم لوگ اس پر عمل کرسکے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے، اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کردیئے ایک قانونی اور دوسری اخلاقی، قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی، جو موسوی شریعت میں ملحوظ تھی یعنی نصف مثقال نقد میں، اور عشر پیداوار میں، یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا ادا کرنا ہر مستطیع اور صاحب نصاب پر واجب ہے، اور اس کا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے، اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا، اس کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا، اور بلند ہمت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی، صحابہ میں دونوں قسم کے لوگ تھے، وہ بھی تھے، جو کل کے لئے آج اٹھا رکھنا حرام سمجھتے تھے، جیسے حضرت ابوذرؓ[1]، اور وہ بھی تھے، جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدموں پر لاکر ڈال دیتے تھے جیسے حضرت ابوبکرؓ[2] اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں یک وقت لٹا دیتے تھے، جیسے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ[3]، اور وہ بھی تھے، جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے، اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے، جیسے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، اور بعض انصار کرام، خدا نے ان کی مدح فرمائی،

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب ما ادی زکوٰتہ فلیس بکنز۔ [2] ترمذی کتاب المناقب فضائل ابوبکرؓ

[3] اسد الغابہ جلد ۳ ص ۳۱۹،

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ	اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود
مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا	اپنا کھانا مسکین اور یتیم اور قیدی
(دھر-١)	کو کھلا دیتے ہیں،
وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ	اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو
كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر-١)	ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود محتاج ہوں

غرض محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہے، اور ہر ایک کے لئے اس کی استعداد اور ہمت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے، اُس نے وہ طریقہ سکھایا ہے جس سے اہلِ حاجت اور نیک کاموں کے لئے ہر وقت امداد مل سکے ورنہ تمام اہلِ دل اور اہلِ استعداد کے مرتبہ کمال کے لئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے اور اس کی خوبیاں اور برائیاں بھی بیان کر دی ہیں، تاکہ امت کے باحوصلہ افرادِ ہمت کے شہپروں سے اُڑ کر سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچنے کی کوشش کریں،

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں مسلم کے اس آخری مرتبۂ کمال کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں،

دانی ایں طائفہ جان و دل	اس فرقہ نے اپنی جان اور دل کو
درباختہ اند و با ہیچ کس ماسوا اللہ	دیدیا ہے اور خدا کے سوا کسی سے دل نہیں لگایا
نپرداختہ اند گفتہ ایشان است الفقیر	ان کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جس کا

گفت جواب بر مذہب فقیہاں خواہی
یا بر مذہب فقیران ؟ گفت بر ہر دو
جواب فرما۔ شبلی گفت بر مذہب فقیہاں
از دویست درم بعد از حولان حول
پنج درم باید داد، و بر مذہب فقیران
در حال ہر دویست درم باید داد
و جان بشکرانہ بر سر باید نہاد۔ فقیہ
گفت، این مذہب از ائمۂ دین گرفتیم
شبلی گفت ما این مذہب از صادق
رب العالمین گرفتیم یعنی ابی بکر صدیق رضی
اللہ عنہ او ہرچہ داشت پیش سید عالم صلی اللہ
علیہ وسلم نہاد و جگر گوشہ خویشتن بشکرانہ
داد (مکتوب ۴۴ سہ صدی)

جواب چاہتے ہو، یا فقرا کے، کہا دونوں
کے، فرمایا، فقہاء کے مذہب کے مطابق
ایک سال گذرنے پر دو سو درم میں سے
پانچ درم اور فقراء کے مسلک پر فوراً پورے
کے پورے دو سو، اور اس نذرانہ کی خوشی
میں اپنی جان بھی سر پہ رکھ کر پیش کرنی
چاہئے، فقیہ نے کہا ہم نے یہ مذہب ائمۂ
دین سے حاصل کیا ہے، فرمایا ہم نے یہ
مسلک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا ہے
کہ جو کچھ تھا وہ سب سرور عالم
(صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے رکھ دیا!
اور اپنی جگر گوشہ (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا
صدیقہ) کو شکرانہ میں پیش کیا،

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی،
آپ کے پاس عمر بھر کبھی اتنا جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آئے جو کچھ ہوتا وہ اسی دن حاجتمندوں
میں تقسیم ہو جاتا، اگر گھر میں رات کو سونے چاندی کے چند خورد ریزے بھی پڑے رہتے تو گھر
میں آرام نہ فرماتے، مگر عام امت کے لئے اپنے مسلک کو فرض نہیں قرار دیا، بلکہ اتنا کہ

اُن کے لئے مقرر کیا گیا، جو اُن کی قوت، استطاعت اور ہمت کے مطابق ہو۔ کہ نجات کا دروازہ غریبوں اور دولتمندوں کے ہر طبقہ کے لئے یکساں کھلا رہے، اور اس لئے تاکہ بے قیدی اور عدمِ پابندی لوگوں کی سستی اور عدمِ عمل کا باعث نہ ہو، مقدارِ معین کے مال پر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی۔ تاکہ جماعت کے مجبور و معذور افراد کی لازمی طور سے دستگیری ہوتی رہے۔

اشتراکیت کا مبحث

دنیا میں امیر و غریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے، ہر تمدن کے آخری دور میں قوم کے مختلف افراد کے درمیان، دولت کی غیر مساوی صورت یقینی طور سے پیدا ہو جاتی ہے، بعض طبقے نہایت دولتمند ہو جاتے ہیں جن کے خزانوں کے لئے زمین کا ایک طبقہ بھی کافی نہیں ہوتا، اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہیں جن کے پاس کھانے کے لئے ایک سوکھا ٹکڑا اور سونے کے لئے ایک بالشت زمین بھی نہیں ہوتی، اور دولتمند طبقوں کی خود غرضی، خود پسندی عیاشی اس حد تک پہنچ جاتی ہے، کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیوں کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چیتھڑا دینے کے روادار نہیں ہوتے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تمام دولت خدا کی طرف سے نہیں بلکہ ان کے علم و ہنر سعی و کوشش اور دست و بازو سے حاصل ہوئی ہے، اس لئے ان سست و ناکارہ افراد کا اس میں کوئی حصہ نہیں، قارون کو جب زکوٰۃ و خیرات کا حکم ہوا تو اُس نے جواب میں یہی کہا

إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي — مجھ کو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے

(قصص - ۸) — یہ سب کچھ ملا ہے

چنانچہ ہر زمانہ کے قارونوں کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور و اعتقاد ہوتا ہے۔

یونان کے آخری دور میں یہی صورت پیدا ہوئی، ایران کے انتہائی زمانہ میں یہی شکل نمودار ہوئی، یورپ کی موجودہ فضا میں یہی آب و ہوا، اقتصادی مشکلات کے گرد باد کا طوفان سیلاب پیدا کر رہی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے، اور سوشلزم، کمیونزم، انارکزم اور بالشوزم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہیں لیکن دنیا میں مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے یہ دنیا کے نئے نقشے تیار کرنے والے جو نقشے بنا رہے ہیں، وہ انسانی فطرت و طبیعت کے اس درجہ مخالف ہیں کہ ان کی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے،

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا، اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذاتی و شخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے، دولت و سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں جانے سے روکا، سود کو حرام قرار دیا، متروکہ جائداد کو صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہیں دیا، نفع عام کی چیزیں شخص کے بجائے جماعت کی ملک قرار دیں، قیصریت اور شہنشاہیت کے بجائے جماعت کی حکومت قائم کی، زمینداری کا پرانا اصول جس میں کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا بدل دیا، اور اس کی حیثیت اجیر و مزدور کی رکھی، انسانی فطرت کے خلاف یہ نہیں کیا کہ سرمایہ کو لے کر تمام افراد میں برابر تقسیم کر دیا جائے، تاکہ دنیا میں کوئی مالک اور مجبور باقی نہ رہے، بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار جس کے پاس مصارف کے بعد مقررہ رقم بچ جائے، اس کے غریب بھائیوں کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کر دی

تاکہ وہ اُس کے ادا کرنے پر مجبور ہو، اور جماعت کا فرض قرار دیا کہ وہ اس رقم سے قابلِ اعانت لوگوں کی دستگیری کرے۔ یہی وہ راز ہے جس کی بناپر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتوں سے محفوظ رہا، اور آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اس پر عملدرآمد ہو، تو یہ خطۂ زمین کے اتنے رقبہ میں جتنے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی حکومت ہے پیدا نہیں ہو سکتے۔ خلافتِ راشدہ کے عہد میں حضرت عثمانؓ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراط کی حد تک پہونچ گئی تھی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق کہ جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، یہ فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے[1]، اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو، وہ خدا کی راہ میں دیدے، در شام کے دولت مند صحابہؓ نے اُن کی مخالفت کی، اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ میں دے کر بچ سکتے ہیں، تو حضرت ابوذرؓ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی، اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی، کیونکہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا، اور عرب کے آرام و آسائش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ میں کوئی خیرات کا قبول کرنے والا باقی نہیں رہا[2]۔

اقتصادی اور تمدنی فائدے

زکوٰۃ میں روحانی اور اخلاقی فائدوں کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہیں، اوپر گذر چکا ہے کہ زکوٰۃ ان ہی

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۱۶۷۔ [2] فتح الباری شرح بخاری جلد ۳ ص ۲۲۵ و طبقات ابن سعد ترجمہ عمر بن عبد العزیز ص ۲۵۶

چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن میں دو صفتیں پائی جائیں یعنی بقا اور نمو، بقا سے یہ مقصود ہے کہ
وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں، کیونکہ جو چیز ایسی نہ ہوگی، اس کی تجارت میں چنداں
فائدہ ہے، اور نہ وہ دوسروں کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے، اسی لئے سبزیوں اور
ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں ہے، اور نمو سے یہ مقصود ہے کہ ان میں یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ
کی بنا پر افزائش کی صلاحیت ہو، اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھروں میں نیز مزروعہ
زمین اور مکان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے، ان دونوں نکتوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شریعت
نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھیں بلکہ
محنت کوشش اور جد وجہد سے اس کو ترقی دیں، ورنہ اصل سرمایہ میں سال بسال کمی ہوتی جائیگی
جس کو فطرۃً کوئی برداشت نہیں کرسکتا، اس طرح زکوٰۃ کا ایک بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے
کہ تجارت وزراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں، ترقی دی جائے، کیونکہ جب یہ شخص کو ایک
حد پر سال میں خاص رقم ادا کرنی پڑے گی، تو وہ کوشش کرے گا کہ جہاں تک ہو
یہ رقم منافعہ سے ادا کرے، اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے، اس بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو ان
ہی چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا جن میں نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو، اور اسی بنا پر زکوٰۃ
کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی، تاکہ ہر شخص اپنے مال پر بڑھاؤ کا ل
پورا فائدہ اٹھا سکے، صحابہؓ کرام اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتے
تھے حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان لوگوں کو جو یتیموں کے سرمایوں کے متولی تھے، ہدایت
کی کہ وہ ان کو تجارت میں لگائیں، تاکہ ان کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں

سب صرف نہ ہوجائے،

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیا کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہاں ن
کا اکثر حصہ بیکار زمین میں مدفون رکھا جاتا ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ
حق ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کرکے یہ نکتہ بتادیا تھا،

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ	اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گاڑ کر
وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا	رکھتے ہیں، اور اس کو خدا کی راہ میں
فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ	نہیں صرف کرتے، اُن کو دردناک
أَلِيمٍ (توبہ - ۵)	عذاب کی بشارت دو،

یہ دردناک عذاب قیامت میں تو کچھ ہوگا وہ ہوگا، اس دنیا میں بھی اُن کے لئے
اقتصادی دردناک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کو تباہ کرتے
ہیں، اور اس سے دولت کی افزائش اور ترقی کا کام لینے کے بجائے اس کو بے کار اور
معدوم کرکے ملک کو فقر و محتاجی کے عذاب الیم میں مبتلا کرتے ہیں، اور بالآخر خود مبتلا ہوتے
ہیں، اس لئے افراد کی خوش حالی، صحت، اور مالی ترقی اسی میں ہے کہ وہ اپنی دولت کو مناسب
طور سے صرف کریں،

فقراء کی ضرورت اب دوسری طرف فقراء کا گروہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے
تمام مشاہیر مذاہب نے انسانوں کے اس قابلِ رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور ترحم کی نگاہ
دیکھا ہے، اور اس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے، مگر درحقیقت اُن کے رحم و ہمدردی

درمحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی کے پھوڑا یا زخم ہو، اور اس کا دوست اس کی محبت
اور خیر خواہی کی بنا پر ہمیشہ اس کے پھوڑے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے کہ اسے ہوا
نہ لگے، اور وہ ٹوٹنے نہ پائے، اور نہ کسی جراح کا نشتر اس کو چیرے کہ ان باتوں سے اس
کو تکلیف ہوگی، کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کی سچی
دوستی کا ثبوت ہوگا،

گذشتہ مصلحین نے عموماً اس میں افراط اور تفریط سے کام لیا ہے، بعض نے تو اس
زخم میں صرف نشتر ہی لگایا ہے، اور مرہم کا کوئی پھاہا نہیں رکھا، چنانچہ زردشتی
مذہب میں سوال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے، اور اس کے بالمقابل بودھ مذہب نے اس
زخم کو سرتاپا مرہم سے ڈھانپ دیا، اور بھکشوؤں کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال و بھیک کے لئے
پیدا کیا گیا ہے، لیکن اسلام نے نہایت حکمت کیساتھ اس زخم کو بھرنے اور اس پھوڑے کو دور کرنے
کے لئے ایک تجربہ کار اور ماہر جراح کی طرح دونوں عمل کئے ہیں، اس نے اس غریب اور
دردمند طبقہ کے زخم میں نشتر بھی لگایا ہے، اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے، یہ مرہم اس
کی وہ مہربانیاں، تسلیاں، بشارتیں، اور عملی امداد و اعانت کی تدبیریں ہیں، جو اس
کے دل کی ڈھارس اور اس کی امیدوں کا سہارا ہیں، اور نشتر اس کی وہ تنبیہات
ہیں، جو اس نے اس طبقہ کو دنائت نفس، کم ہمتی، اپاہج، دوسروں کی دست نگری
اور ان کے سہارے جینے کی ذلت سے بچانے کے لئے جاری کی ہیں، اس نے بلا ضرورت
کے لئے دوسروں سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہیں کی، لیکن بہ اخلاقی طریق

سے اُن کو اس ذلّت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے، اور اُن کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے،

دوسری صورت: اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب میں ہے کہ جو کچھ ہے نذر دو، اور غریبوں اور مسکینوں کو دے ڈالو، نہایت عالی اخلاقی تعلیم اور رحم و محبت کا نہایت بلند منظر نظر آتا ہے، لیکن ضرورت تصویر کا دوسرا رُخ دیکھئے، تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دولتمندوں کو سب کچھ غریبوں اور مسکینوں کو دے دینے کی ترغیب دے رہے ہیں، اور اس سے دینے والوں کے جذبۂ ایثار اور اُن کے جود و سخا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہیں، اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقہ کو گداگری کی لعنت، بھیک مانگنے کی پستی، اور دوسرے کے سہارے جینے کی ذلت کا خوگر بنا رہے ہیں، اور بے محنت کئے دولت پانے کا سبق پڑھا رہے ہیں، اس طرح اُن کے لئے گداگری، دناءت، پستی، ذلت، سفلہ پن، کم ہمتی، نامردی اور تمام رذیل و پست اخلاق کا گڑھا تیار کر رہے ہیں، جہاں یہ تمام نجاستیں اکٹھی ہوں گی، کیا یہ انسانیت کے ساتھ رحم ہے؟ کیا یہ نوعِ بشر کے ساتھ محبت ہے؟ کیا یہ جنسِ بنی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟

پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہیں ہوئی، وہ انسانوں کے ہر طبقہ کے معلّم اور مزکّی بنا کر بھیجے گئے ہیں، غریب و امیر، مسکین و دولتمند دونوں آپ کی نگاہ میں یکساں ہیں، اس لئے آپ نے کسی ایک ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا، بلکہ دونوں طبقوں کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر برابر کیا، اور دونوں کی تعلیمات و اصلاحات میں

سے دونوں کو مساوی حصہ دیا ہے،

یہ اخلاقی صلاح کی وہ نازک پل صراط ہے جس پر نبیوں کے خاتم اور دینوں کے مکمل علیہ السلام کے سوا دنیا کے کسی اخلاقی معلم اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے اور نہ وہ ٹھیک ٹھیک میں ترازو کے دونوں پلّوں کو برابر رکھ سکا، اگر غریبوں کی اصلاح کی خاطر صدقہ و خیرات اور دوسروں کی اعانت و ہمدردی کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں، تو انسانی جوہر شرافت کی بربادی کے ساتھ امراء کا طبقہ، اپنے معائب کی فراوانی اور کثرت سے ہلاک، اور اخلاقی محاسن سے تمامتر تہی مایہ ہو جائے گا، اور اگر غرباء اور فقراء کو ہر قسم کی گداگری اور دریوزہ گری کی اجازت دیدی جائے، تو انسانوں کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی، اسی لئے داعی اسلام علیہ السلام نے انسانوں کے دونوں طبقوں کے ساتھ انصاف کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی جس سے دونوں طبقوں کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا، اور دونوں کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش اور اپنے اپنے نقص اور کمزوریوں کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی۔ ایک طرف تو اسلام نے امراء اور دولت مندوں کے طبقہ کو خطاب کر کے کہا :-

أَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (ضحیٰ) — مانگنے والے کو جھڑکی نہ دے،

دوسری طرف خوددار و بے نیاز فقراء اور غریبوں کے طبقہ کی مدح فرمائی۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ — ناواقف اُن کی خودداری اور سوال
التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ — کی ذلت سے بچنے کے سبب ان کو

النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ — دولتمند سمجھتا ہے، تو اُن کو اُن کی نشانی سے پہچانتا ہے، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ (بقرہ - ۳۷)

دریوزہ گری، بھیک مانگنے کو خلافِ تقویٰ قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ کر حج کرتے تھے، اُن کو خطاب کرکے کہا:-

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ؕ (بقرہ - ۲۵) — اور زادِ راہ لے کر چلو کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے۔

ایک طرف دولتمندوں کو فرمایا کہ تمہارا حسنِ خلق یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے، اس کو خالی مت لوٹاؤ، وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ، اگرچہ چھوہارے کی ایک پھانک ہی کیوں نہ ہو۔[1] دوسری طرف فقیروں کو فرمایا کہ تمہاری خودداری بھی ضروری ہے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ "اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِنَ الْیَدِ السُّفْلٰی"[2] اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے (یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانوں کے دونوں طبقوں کو اپنے فیض سے معمور کیا، اور دونوں کے لئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا۔

صدقہ و خیرات درحقیقت وہ پانی ہے، جو دینے والے کے قلوب و نفوس کے تمام میل اور گندگی [illegible] کو صاف نہ کرتی، لیکن وہ خود حبِ مال، بخل اور [illegible]

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ ۔ [2] ایضاً باب الاستعفاف عن المسئلہ

کوڑے کر باہر نکلتا ہے تو حرص وطمع کے پیاسے اس کو چلو میں لے کر پینے لگتے ہیں، اسی لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:-

اِنَّ ھٰذِہِ الصَّدَقَاتِ اِنَّمَا ھِیَ اَوْسَاخُ النَّاسِ۔[1]

یہ صدقہ لوگوں کا میل ہے۔

اگر آج اُن فقیروں اور گداگروں کی صورتوں اور سیرتوں پر نظر ڈالو جو استحقاقِ شرعی کے بغیر اس مال سے زندہ رہتے ہیں، تو نظر آجائے گا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو لوگوں کے دلوں کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی، اور وہ تمام باتیں جو اُن کے لازمی اخلاقی نتائج ہیں، اُن میں سے کونسی چیز ہے، جو غیر مستحق ابناء السبیل، فقراء اور [illegible] گداگروں کی امتیازی شان نہیں بن گئی ہے، اور درحقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوٰۃ دینے والوں کے دامن سے چھوٹ کر فقراء اور گداگروں کے دامنِ دل کو نجس بنا دیتا ہے، مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بعض دفعہ قدرتی بے بسی مجبور کر دیتی ہے، جب نفس [illegible] انسان کو اپنی جان بچانے کے لئے گندہ سے گندہ اور غلیظ سے غلیظ پانی کے پینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اور اس وقت اس اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو [illegible] سے صدقہ وخیرات کے قبول کرنے کی اجازت دی جائے۔ شریعتِ محمدیہ نے اسی [illegible] اسی حیثیت سے لوگوں کو اس کے قبول کرنے کی اجازت دی ہے، اور مجبور [illegible]

[1] مسلم کتاب الزکوٰۃ باب ترک استعمال آل النبی علی الصدقۃ۔

کو ذلیل و رسوا کرنے سے تمہارے اس عظیم الشان کارنامہ کی حقیقت باطل ہو جائیگی، اور یہ محبوب حرفِ غلط کی طرح تمہارے نامۂ اعمال سے مٹ جائے گا، فرمایا،

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ
مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی لَّهُمْ
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ
عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ قَوْلٌ
مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ
صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَآ اَذًی وَاللّٰهُ
غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ط

(بقرہ - ۳۶)

جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ
کرتے ہیں، اور اس کے بعد نہ احسان
جتاتے ہیں، نہ طعنہ دیتے ہیں، ان کا
اجر اُن کے خدا کے پاس امانت ہے
اور نہ اُن کو قیامت میں کوئی خوف ہے
اور نہ وہ غمگین ہوں گے، کچھ نرمی کی
بات کہنا اور چشم پوشی کر کے سائل
کو ٹال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے
جس کے بعد طعنہ دیا جائے، یا احسان
جتایا جائے، خدا تمہاری ایسی خیرات
سے بے نیاز ہے، اور شرارت ایسے
کاموں پر بردباری سے درگذر کرنے والا ہے،

اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک دلنشیں تشبیہ سے واضح کیا ہے،

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا
صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی

مسلمانو! اپنے صدقوں کو احسان جتا کر
اور طعنہ دے کر برباد نہ کرو، جیسے کہ وہ

كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ

(بقرہ - ۳۶)

اپنے صدقوں کو برباد کرتا ہے جو شخص لوگوں کے دکھانے کو دیتا ہے، اور خدا پر اور قیامت پر ایمان نہیں لاتا۔ اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹان کی ہے جس پر کچھ گرد پڑی ہوئی ہو، اور اس پر ایک پانی پڑ گیا ہو جس نے اس کو صاف اور چٹیل کر دیا کہ اب اس پر کوئی چیز جم نہیں سکتی ہے، ان لوگوں نے جو کام کیا، اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکے، خدا کافروں کو ہدایت یاب نہیں کرتا،

نیز اور اسباب کے علاوہ یہی ایک سبب تھا کہ اسلام نے زکوٰۃ دینے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے خود کسی کو نہ دیں، بلکہ وہ اس کو امیرِ جماعت کے بیت المال میں جمع کریں اور وہ امیر حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے، تاکہ اس طرح غریب لینے والا اگر شریف مسلمان ہو تو ذاتی صورت سے کسی دوسرے شخص کا ممنونِ احسان بن کر اپنی ذلت نہ محسوس کرے، اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منت رکھنے کا موقع نہ ملے، اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے، ساتھ ہی یہ فقرا اور معذوروں کو دربدر ٹھوکر کھانے کی رسوائی، اور

ہر فرد ہر وقت سے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلت سے بچایا جائے۔

۲- اسی لئے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے کہ علانیہ دینے میں بھی سائل بے حیائی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے کیونکہ جب کسی کی ذلت و فاقہ کی داستان عام ہو جاتی ہے، تو پھر اپنے فعل سے اس کو غیرت اور شرم نہیں آتی اور اس کا ڈر تھا کہ اگر اس کا انسداد نہ کیا جاتا تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ دنیا میں گداگری دریوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشہ کی اشاعت کا سبب بن جاتا، اور یہ اخفا و راز چھپا کر دینے کی صورت اس لئے بھی اچھی ہے کہ دینے والا نمائش اور شہرت طلبی کی آلائشوں سے اپنے خلوص کو محفوظ رکھ سکے گا۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔[1]

لیکن بعض موقعے ایسے بھی ہیں جہاں صدقہ خیرات علانیہ دینے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور وہ یہ کہ دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خاص نیت ہو، یا خود سائل پیش دستی کرکے مجمع میں سوال کر بیٹھے، اور کوئی نیک نفس شامل ہو، چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا۔

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ (بقرہ ۔ ۳۷)

اگر تم صدقہ کو ظاہر کرکے دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر تم اس کو چھپا کر فقیروں کو دو تو یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہے۔

۱؎ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل اخفاء صدقہ۔

کمزور ہو جائے کہ حقوقِ اسلام ادا کرنے میں اس قسم کی فقیہانہ تجسس کرنے کی ضرورت ہو، ورنہ صحابہ
کی ترغیب کے لیے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا، مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی سی معمولی
رقم کے لیے جب تک اخباروں کے پورے کالم سیاہ نہ کر دیے جائیں، دینے والوں کے
نزدیک خدا کو اُن کے عطیہ کی خبر ہی نہیں ہوتی،

اسلام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دارومدار صرف بلند ہمتی اور عالی حوصلگی پر ہے، بلند ہمتی کا
اقتضاء یہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچ کر نہ ٹھہرے، اور اس کو دنیا کی تمام
چیزیں ہیچ نظر آئیں، اس بنا پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوٰۃ و صدقہ میں مال کا عمدہ اور
بہتر حصہ دیا جائے، تاکہ مبتذل اور ادنیٰ درجہ کی چیزوں کے دینے اور لینے سے دینے والے اور
لینے والے کے اندر پستی اور دناءت نہ پیدا ہو، کیونکہ اس سے لینے والے کے اندر یہ درجہ کا
لالچ اور چچھورا پن پیدا ہوگا کہ معمولی اور سڑی گلی چیز تک اس کے لالچ سے نہیں بچ سکتی اور
دوسری طرف دینے والے کی روح میں بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور طہارت کے بجائے
بخالت، حرص، اور کمینہ پن، اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہوگی
کیونکہ کوئی بری چیز کسی کو دینے کا منشا دوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہیں
ہوتا، بلکہ اس بیکار اور سڑی گلی چیز سے اپنے دامن اور صحنِ خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے، اس لیے
اس سے دینے والے کے دل میں صفائی کے بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے، روایتوں میں ہے کہ
صحابہ کو جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا
کسبِ معاش کا موقع نہیں ملتا تھا، اس لیے لوگ کھجوروں کے بدمزہ خوشے لا کر مسجدوں میں لٹکا دیتے تھے اور

جب وہ گرسنہ بھوک کی شدت سے بیتاب ہوجاتا تھا، تو مجبوراً ان میں سے دو چار کھجوریں توڑ کر کھا لیتا تھا، چونکہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ	مسلمانو! اپنی کمائی سے اور اس چیز
طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا	سے جو تمہارے لئے ہم نے زمین سے نکالی
لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا	عمدہ حصہ خیرات کرو، اور ان میں سے
الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَ	ردی مال کی خیرات کا قصد نہ کرو،
لَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ	حالانکہ اگر ردی قسم کو دیا جائے تو خود
تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ	تم نہ لوگے، لیکن یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ،
اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ،	اور یقین کرو کہ خدا ایسی ردی قسم کی
	خیرات سے بے نیاز ہے، اور وہ خوبیوں والا ہے
(بقرہ ۔ ۳۷)	(خوبیوں کی والی چیز پسند کرتا ہے)

بہرحال فقراء و مساکین کی دنائت اور حرص و طمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُن ہی لوگوں کو زکوٰۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے، جو باوجود تنگدستی و بے بضاعتی کے خودداری اور قناعت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، کیونکہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی، تو ہر شخص خود بخود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا، صحابہ کرام میں سب سے زیادہ مفلس و نادار اصحابِ صفہ تھے، لیکن ان کی خودداری اور قناعت کا یہ حال تھا کہ پریشانی صورت کے سوا کوئی چیز اُن کے فقر و فاقہ کا راز فاش نہیں کر سکتی تھی، اس بنا پر اسلام نے ان کو

فرمایا جو شخص مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگے گا نہیں، تو میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں۔ آپ کے آزاد کردہ غلام ثوبانؓ بولے میں یہ ضمانت کرتا ہوں، چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔[1]

حکیمؓ بن حزام ایک صحابی تھے، انھوں نے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، آپ نے عنایت کیا، پھر مانگا، پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا، اے حکیم! یہ مال بظاہر نہایت شیریں اور خوشرنگ چیز ہے جو اس کو شرافت کے ساتھ لیگا، اس کو اس میں برکت دیجائے گی، اور جو لالچ کے ساتھ لیگا، اس کو برکت نہ ملے گی، اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھاتا چلا جائے، اور اس کا پیٹ نہ بھرے، اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے، حکیم نے کہا، یا رسول اللہ آج سے میں پھر کسی سے کچھ نہ مانگوں گا، اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا (بھی) خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں خلفاء ان کو ان کا وظیفہ لینے کے لیے بلاتے تھے، اور وہ انکار کرتے اور آخر عمر تک اس انکار پر قائم رہے۔[2]

اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگوں کیلئے جو صاحبِ دست و بازو ہوں یعنی جن کے ہاتھ پاؤں، اور اعضاء صحیح و سالم ہوں، بھیک مانگنے سے سخت ممانعت کردی گئی فرمایا کہ

لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَلَا لِذِي	غیر محتاج، اور صحیح و سالم آدمی کے لیے
مِرَّةٍ سَوِيٍّ (ترمذی کتاب الزکوٰۃ)	صدقہ حلال نہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلۃ [2] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسئلہ

بدلے میں انسان کی شرم وحیا، غیرت وآبرو کو برباد کر دیتا ہے، فرمایا۔

ما زال الرجل یسئل الناس حتی یاتی یوم القیامة لیس فی وجهه مزعة لحم (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب من سئل الناس تکثرا)

آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے، یہاں تک کہ وہ قیامت کے روز اس طرح آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا۔

یہ اس کی سزا ہوگی کہ اس نے دنیا میں مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت وآبرو کی رونق خود دھو دی تھی۔

ان ضروری اصلاحات کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا، اور ان تمام برائیوں اور بداخلاقیوں کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانوں میں پیدا ہو سکتی تھیں اور ساتھ ہی انسانی برادری کے دونوں طبقوں کو ترازو کے پلڑے میں برابر رکھ کر ان کو باہمی معاونت، باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا، اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کر دیا، پست وبلند کے تفرقے کس حد تک کم کر دیئے، اور اس اقتصادی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ بتا دیا جو اکثر اپنی بھیانک شکلوں سے اس کو ڈرایا کرتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت مند صحابہؓ میں یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین وملت کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت نثار کر کے بھی سیر نہ ہوتے تھے، اور غریب صحابیوں میں یہ قناعت اور خودداری پیدا ہو گئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے، دولتمند بخوشی آکر بیت المال کے دروازوں تک خود دے آتے تھے، اور غریب اپنے افلاس وحاجت کو خدا کے

سود دوسروں کے سامنے پیش کرنا توہین سمجھتے تھے۔ اور تیسری طرف تجارتی مہم

کے بعد جب فراغت آتی تو بہت سے بیت المال میں تو سرمایہ بہت تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مد

مصرف کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی، ضرورتمندوں کو اس رقم سے قرض دیا جاتا تھا،

اس طرح یہ ایک ایسا اقتصادی نظام تھا کہ بلا نفع قرض دیتے تھے، فرد کو جو تنگی

ہوتا ہے، وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا، اور سود کی لعنت کے بغیر دو دستہ

راستہ کھلا ہوا تھا،

سلہ تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۲۸۱،

روزہ

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ)

روزہ کا مفہوم: روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے، عربی میں اس کو صوم کہتے ہیں، جس کے لفظی معنی رکنے اور چپ رہنے کے ہیں، بعض مفسرین کی تفسیر کے مطابق قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں صبر بھی کہا گیا ہے جس کے معنی ضبط نفس، ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں، ان معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفس کو اس کی بہیمی خواہشوں سے بچنے اور رکنے اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضبط اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے، روزانہ استعمال میں انسانی خواہشوں اور نفسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں، یعنی کھانا اور پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، ان ہی سے ایک مدت معین تک رکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے، لیکن درحقیقت ان ظاہری خواہشوں کے ساتھ باطنی خیالات اور برے جذبوں سے دل و زبان کو محفوظ رکھنا بھی خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔

روزہ کی ابتدائی تاریخ: روزہ کی ابتدائی تاریخ کا معلوم کرنا مشکل ہے، مشہور حکیم ہربرٹ اسپنسر نے تصنیف پرنسپلز آف سوشیالوجی اصول معتقدات [illegible] کی تحقیق کی ہے۔

استقراء کی بنا پر قیاس کرتا ہے کہ روزہ کی ابتدا ان میں اس طرح ہوئی کہ لوگ وحشت کے زمانہ میں خود بھوکے رہتے ہوں گے، اور سمجھتے ہوں گے کہ ہمارے بدلہ ہمارا کھانا اس طرح دیوتاؤں کو پہونچ جاتا ہے[1] لیکن یہ قیاس ارباب خرد کی نگاہوں میں سند قبول حاصل نہ کر سکا۔

بہرحال مشرکانہ مذاہب میں روزہ کی ابتدا اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہوں لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتدا اور غایت کی تشریح میں اپنے پیروؤں کی وکالت کا محتاج نہیں وہ بآواز بلند مدعی ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ	مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ	جس طرح تم سے پہلی قوموں پر فرض
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ ۲۳)	کیا گیا تاکہ تم پرہیزگار بنو،
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ	ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن
فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ	اتارا گیا، جو انسانوں کیلئے سراپا ہدایت
وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ	ہدایت کی دلیلیں اور حق و باطل میں فرق
فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ	پھر اب جو اس رمضان کو پائے وہ اس مہینہ
وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ	روزہ رکھے، اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو
فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ	دوسرے دنوں میں، خدا تم سے آسانی
بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ	چاہتا ہے سختی نہیں تاکہ تم روزوں کی

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۱۰ ص ۱۹۴ فسٹنگ

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	تعداد پوری کر سکو، اور یہ روزہ اس لئے فرض ہوا، کہ تم خدا کی اس ہدایت دینے پر اس کی بڑائی کرو، تاکہ تم شکر گزار ہو،
(بقرہ - ۲۳)	

ان آیاتِ پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام، بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی اہمیت، اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں، ذیل کے صفحات میں بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں،

روزہ کی مذہبی تاریخ

قرآن پاک نے ان آیتوں میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعہ احکام کا ایک جز رہا ہے، جاہل عرب کا پیغمبر امی جو بقول مخالفین، عالم کی تاریخ سے ناواقف تھا، وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ فرض عبادت رہی، اگر یہ دعویٰ تمامتر صحت پر مبنی ہے تو اُمّی کے علم کے مافوق ذرائع میں کیا شک رہ جاتا ہے؟ اس دعوی کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین مآخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزہ (فاسٹنگ) لکھتا ہے

"روزہ کے اصول اور طریقے گو آب و ہوا، قومیت و تہذیب اور گرد و پیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہیں، لیکن بمشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں، جس کے مذہبی نظام میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو،"

آگے چل کر لکھتا ہے،

"گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے"

اور دوسرے روزوں کے احکام بھی بصراحت مذکور ہیں۔

عیسائی مذہب میں اگرچہ ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ نے بھی چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا،[۱] حضرت یحییٰ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گویا پیشرو تھے، وہ بھی روزے رکھتے تھے، اور اُن کی اُمت بھی روزہ رکھتی تھی۔[۲] یہود نے مختلف زمانوں میں مختلف واقعات کی یادگاریں بہت سے روزے بڑھا لیے تھے، اور وہ زیادہ تر غم کے روزے تھے، اس غم کو ظاہر کرنے کے لیے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اداس اور غمگین بنا لیتے تھے۔[۳] حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانہ میں غم کے ان مصنوعی روزوں کو منع کر دیا، غالباً اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیوں نے آکر حضرت عیسیٰ پر اعتراض کیا کہ تیرے شاگرد کیوں روزہ نہیں رکھتے، حضرت عیسیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا،

"کیا براتی جب تک دولہا اُن کے ساتھ ہے روزہ رکھ سکتے ہیں؟ جب دولہا اُن کے پاس ہو روزہ نہیں رکھ سکتے، پر وہ دن آئیں گے کہ جب دولہا اُن سے جدا کیا جائے گا، تب ان ہی دنوں میں روزہ رکھیں گے۔" (مرقس ۲-۱۸)

اس تمثیل میں دولہا سے مقصود خود حضرت عیسیٰ کی ذاتِ مبارک اور براتی سے مقصود اُن کے پیرو اور حواری ہیں، ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبر اپنی امت میں موجود رہے، امت کو غم منانے کی ضرورت نہیں، ان فقروں سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ نے موسوی شریعت کے فرض

۱؎ اول سموئیل ۷-۶ و یرمیاہ ۳۶-۶ ۲؎ متی ۴-۲ ۳؎ مرقس ۲-۱۸ ۴؎ قضاۃ ۲۰-۲۶ سموئیل اول ۷-۶ و ۱۲ لوقا ۲-۳۷ وغیرہ۔

مستحب روزوں کو نہیں، بلکہ غم کے ماتمانہ روزوں کو منع فرمایا، انھوں نے خود یہودیوں کو بے ریا اور مخلصانہ روزہ رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے چنانچہ آپ اپنے حواریوں کو فرماتے ہیں،

"پھر جب تم روزہ رکھو، ریاکاروں کی مانند، اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تم روزہ رکھو اپنے سر میں تیل لگاؤ، اور منہ دھوؤ، تاکہ تم آدمی پر نہیں، بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، تجھ کو آشکارا بدلہ دے" (متی [illegible])

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰؑ سے ان کے شاگرد پوچھتے ہیں، کہ ہم پلید روحوں کو کس طرح نکال سکتے ہیں، وہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں،

"یہ جنس سوائے دعا اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہیں نکل سکتی" (متی [illegible])

اہلِ عرب بھی اسلام کے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے، مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشوراء (یعنی دسویں محرم) کو اس لئے روزہ رکھتے تھے کہ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا[1]، مدینہ میں یہود اپنا عاشوراء الگ مناتے تھے، یعنی وہ اپنے ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے تھے،

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ　　مسلمانو! تم پر روزہ اس طرح فرض کیا گیا

[1] مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۲۴۴ و صحیح بخاری کتاب [illegible]

عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (بقرہ: ۲۳)   جس طرح تم سے پہلوں پر کیا گیا،

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے،

روزہ کی حقیقت انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیوں اور ناکامیوں کے علل واسباب کی اگر تحلیل کی جائے تو آخری نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ دنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے، وہ مختلف اغراض کا پابند ہے، اس کے دل کی کوئی جنبش، اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں، اخلاق جس کا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے، اگر تحقیق کیا جائے تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرضِ نفسانی پر مبنی نظر آئے گی، اس لئے ہماری ہر قسم کی بدبختیاں، اور آلودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں، ضرورت اور غرض، اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں اور اس کے مختلف اغراض ومقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل میں آرزوؤں کا ایک ذخیرہ ہے، تمناؤں کی ایک بھیڑ ہے، اور خود ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے، لیکن کیا خوشنما کپڑوں، عالیشان عمارتوں، لذیذ غذاؤں، اور تیز رفتار سواریوں کے بغیر ہم جی نہیں سکتے؟ فرزند وعیال، زر ومال اور خدم وحشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا؟ بادشاہوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی ہے اور زندہ رہے ہیں، بروایت عام ابراہیم ادہم بادشاہ سے فقیر ہو گئے، اور نہایت پُرمسرت روحانی زندگی بسر کی، خود ساختہ ضرورتوں کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتوں کا وسیع دائرہ

عالمِ روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور منظم قانون اور علل و اسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے
جس پر یقین کر کے ہم آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہر انسان کے لئے قابل ہے، اسی یقین کے سبب
طلبِ روحانی کس قانون کا کہتا ہے کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے، پیغمبر فیضانِ
کے قبول کے لئے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے، دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے
معجزات کا ظہور اس سے کن حالات میں ہوتا ہے، اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے
انکار و مزاحمت پر وہ کیونکر مہاجرۃ الی اللہ کرتا ہے، اور پھر کیونکر دعوت کے منکر ناکام ہوتے
اور اہلِ ایمان فتحیاب و کامیاب ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک چیز مرتب و منظم قوانین کے
مطابق بہ ترتیب ظہور میں آتی ہے، قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر ان کا ذکر آیا ہے لیکن
ان میں زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے۔

فلسفۂ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار ظہور سے
اصول اور نتائج اخذ کر کے ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے، ٹھیک اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے
سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار کے ورود سے قوانینِ ہدایت کے اصول
ہمارے لئے مرتب کرتی ہیں۔

پیغمبرانہ تاریخ کے ان ہی اصول و قوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمالِ
انسانیت کو پہنچ کر فیضانِ نبوت کے قبول اور استعداد کا اظہار کرتا ہے، تو وہ ایک مدت تک
عالمِ انسانی سے الگ ہو کر سکوتِ خلوت میں جلوہ گر ہوتا ہے، اس وقت اس کے دل و دماغ
میں وحی الٰہی کا سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے، کوہِ سینا کا پُر جلال پیغمبر حضرت موسیٰ جب

بیشتر پرہیز کی ضرورت تھی، اور وہ پرہیز روزہ ہے۔ روزہ ۲ھ میں فرض ہوا، اس سے یہ شبہہ

دور ہو جاتا ہے جو بعض واقفوں کو ہوا ہے، کہ چونکہ آغازِ اسلام میں مسلمانوں کو اکثر فاقوں

سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اس لئے اُن کو روزہ کا خوگر کیا گیا، حالانکہ اصولِ اسلام کے رو سے

فاقہ مستوں کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے، شکم سیر دولتمندوں کو اس سے زیادہ ضروری

علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے، کہ مرغوباتِ شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام

تھا، اس لئے روزہ وسطِ اسلام میں فرض کیا گیا، جب کہ لوگ توحید، نماز اور احکامِ قرآنی

خوگر ہو چکے تھے، اس لئے اس کا یہی مناسب زمانہ تھا جو موزوں تھا۔

ایامِ روزہ کی تحدید

روزہ ایک قسم کی دوا ہے، اور دوا کو بقدرِ دوا ہی ہونا چاہیے تھا، اگر پورا سال

اس دوا میں صرف کر دیا جاتا تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا، اور مسلمانوں کی

جسمانی جدوجہد کا خاتمہ ہو جاتا، اور اُن کی شگفتگی مزاج مستحالی یا عبادت کا اثر قبول

کرتی ہے، لیکن ایک دو روز کا تجربہ بھی روزہ نہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس

دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا۔ اس لئے اسلام نے روزہ کے لئے سال کے بارہ مہینوں میں

سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ اس کے لئے مقرر کیا، اس ایک مہینہ کی تخصیص بھی ضروری

تھی تاکہ تمام افرادِ امت بیک وقت اس فرض کو ادا کر کے اس کے مقاصد حاصل

کریں، اور اس کے لئے وہی زمانہ موزوں تھا جس میں خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا یعنی رمضان

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تک زندہ رہے، اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی رمضان ہی میں روزے رکھے

لہ تاریخ ابن جریر طبری واقعات ۲ھ روزہ فی رمضان ... زاد المعاد ابن قیم جلد اول ...

درست نہ تھا، امتِ محمدیہ پوری دنیا میں اسی مہینہ کو ماہِ صیام مانتی ہے، اور پورے مہینہ بھر حسبِ توفیق روزہ رکھتی ہے چونکہ روزہ بہر حال مشقت کی چیز ہے، اس لئے قرآن پاک میں ماہِ رمضان کے روزوں کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے، تاکہ نفسِ انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو، پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ-۲۳) — اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا،

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہیں کیا گیا، بلکہ

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ-۲۳) — جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کیا گیا تھا،

اب بھی مدت نہیں بتائی گئی، اس کے بعد فرمایا گیا،

أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ (البقرہ-۲۳) — چند گنے ہوئے دن،

مدت اب بھی نہیں بتائی، البتہ اس بلیغ انداز سے زمانۂ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا کہ جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ پڑ جائے، اور فرمایا "چند گنے ہوئے دن" اس کے بعد ہی روزوں کی رعایتوں کا ذکر شروع کر دیا گیا، تاکہ طبیعت متوجہ رہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (۲۳) — تو جو تم میں بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے چند دنوں کی گنتی۔

روزہ سے بچ سکتے ہیں، حالانکہ یہ صریح غلط ہے، اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ غریب روزے رکھیں اور امرا فدیہ دیکر روزہ سے مستثنیٰ ہو جائیں، ایسی تفریق اسلام کے فرائض میں کبھی روا نہیں رکھی گئی اور اسلام کا تواتر عمل اس کے بالکل خلاف ہے اور آیت مابعد فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (جو رمضان کے مہینہ میں ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے) کے سراسر منافی ہے،

تحقیق یہ ہے کہ اطاقت کے معنی کسی کام کو مشکل کے ساتھ کر سکنے کے ہیں یُطِیْقُوْنَهٗ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ روزوں کے بدلے ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں

ف۔ طوق طاقۃ کا باب فعل سے مصدر ہے، اس کے ثلاثی مصدر سے فعل نہیں بنتا، فعل بنانے کے لئے باب افعال مستعمل ہے اور طاقۃ کے معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ میں یہ لکھے ہیں

وَالطوق الطاقة اى اقصٰى غايته	طوق کے معنی طاقت کے ہیں، یعنی قوت کی
وَهو اسم لمقدار ما يمكن ان	انتہائی زیادت اور وہ اس مقدار کا نام
يفعله بمشقة منه۔	ہے جس کو آدمی مشقت و مشکل کے ساتھ کر سکے

طاقت کے اس معنی کی تائید قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے، قرآن پاک میں ہے،

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ، (بقرہ ۷ - ۴۰)	اے ہمارے پروردگار اور ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کی ہم کو طاقت نہیں،

"جس کی ہم کو طاقت نہیں" کے یہ معنی نہیں ہیں، جس کی ہم کو دسترس نہیں، یعنی جس کو ہم کر ہی نہ سکتے کیونکہ قرآن پاک کے نص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جس کو وہ کر ہی نہ سکیں فرمایا،

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا	اللہ کسی نفس کو حکم نہیں دیتا مگر

عذر کے دور ہونے کے بعد قضا رکھے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عذر دائمی ہو اور ناقابلِ ازالہ ہو، جیسے کوئی دائم المریض بہت ہی کمزور ہو، یا بہت بوڑھا (شیخ فانی) ہو جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو تو وہ روزہ قضا کرے اور ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دیدے، اس کے لیے یہ آیت ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ	اور ان پر جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں
طَعَامُ مِسْكِينٍ ۝ (بقرہ ع ۲۳)	ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب بمشکل روزہ پر قادر ہو اس کو فدیہ کی اجازت ہو تو جو بالکل قادر نہ ہو تو اس کو تو بدرجۂ اولیٰ فدیہ کی اجازت ہوگی کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔

(بقیہ ص ۳۰۵) فلیطعما مکان کل یوم مسکینا۔ کہ وہ دونوں بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا دیں۔ تو حدیث میں مذکور کہ یطیقان الصیام کے معنی نہیں ہو سکتے کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں کیونکہ استطاعت کے ساتھ اجازت جمع نہیں ہو سکتی۔ بس اس کے معنی یہی ہوں گے کہ جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

پہلے ایڈیشن لکھتے وقت ذریت علما کی تائید مجھے مل نہیں سکی تھی، اب بحمد اللہ کہ یہ تائید بھی ہاتھ آگئی [illegible] تمام اہل حدیث شارح عون المعبود شرح ابی داؤد میں اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں لکن مع شدۃ [illegible] تعب و مشقۃ [illegible] شیخ الحدیث [illegible] تعالیٰ کے [illegible] بھی [illegible]۔

[illegible] وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ کا ترجمہ [illegible] روزہ [illegible]

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب

علم و مذہبیت شناسی کے بعض مدعی، جو تمام عبادات و پرستش کی غرض و غایت قرار دیتے ہیں کہ وحشی انسانوں کا تخیل یہ تھا کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، اور روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لئے جسمانی زحمت کشی ہے، اور ان غلط فہمیوں کے لئے دیگر مذاہب میں گو لغزش گاہیں موجود ہیں چنانچہ جوگیوں اور جینیوں میں روزہ کی غیر معمولی مدت اور اس کی سختیاں اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہودیوں کی اصطلاح میں روزہ کے لئے "نفس کو دکھ دینے" کی اصطلاح جاری تھی، چنانچہ توراۃ میں روزہ کے لئے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے، سفر احبار (۱۶-۲۹) میں ہے:-

"اور یہ تمہارے لئے دائمی رسم ہوگی کہ ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ تم سے ہر ایک خواہ وہ دیس کا ہو، خواہ پردیسی جس کی بود و باش تم میں ہے، اپنی جان کو دکھ دے"

توراۃ کے سفر عدد (۲۹-۷) میں ہے:-

"اور اس ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی۔ اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو اور کچھ کام نہ کرو۔"

یہ اصطلاح توراۃ کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے لئے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ صوم ہے، اور صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے،

خدا نے قرآن پاک میں مسلمانوں کو جہاں روزے کا حکم دیا ہے، وہاں یہ الفاظ بھی فرما دیئے ہیں،

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرة - ٢٣)

خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا،

اسلام کا عام قانون ہے،

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (بقرة - ٤٠)

خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا،

قرآن نے پیغمبرؐ کی توصیف ان لفظوں میں کی ہے،

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف ١٩)

وہ ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے برائیوں سے روکتا ہے، اور گندی چیزوں کو حرام کرتا ہے، اور ان طوق و زنجیروں کو جو ان کے اوپر پڑی ہیں، ان سے اتارتا ہے،

ان امور کا منشا یہ ہے کہ اسلامی عبادات و احکام میں کوئی چیز بھی اس غرض سے نہیں رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے، روزہ بھی اس سلسلہ میں داخل ہے، اسی لئے اسلام نے روزہ کی ان سختیوں کو جو لوگوں نے بڑھا رکھی تھیں بہت کچھ کم کر دیا،

روزہ میں اصلاحات اسلام نے روزہ کی سختیوں کو جس حد تک کم کیا، اور اس میں جو

گئیں اور وہ حسب ذیل ہیں،

۱۔ سب سے اوّل یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے، ان میں اکثر روزہ صرف پیروؤں کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا، مثلاً ہندوؤں میں غیر برہمن کے لئے کوئی روزہ ضروری نہیں، پارسیوں کے یہاں صرف دستور اور پیشوا کے لئے روزہ تھا، یونانیوں میں صرف عورتوں کے لئے روزہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروانِ مذہب کے لئے برابر طور سے ضروری ہے،

اسلام میں پیشوا، غیر پیشوا، عورت، مرد کی کوئی تخصیص نہیں، اس نے تمام پیروؤں کو عام حکم دیا، اور اس میں کسی چیز کی کوئی تخصیص نہیں کی

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ — تم میں جو موجود ہو وہ مہینہ بھر

فَلْيَصُمْهُ ۰ (بقرہ-۲۳) — روزہ رکھے،

۲۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً شمسی سال معتبر ہے، شمسی سال میں روزہ کی جو تاریخیں جن موسموں میں متعین ہوں گی، ان میں تغیر و تبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر وہ گرمی سردی کے موسم میں چھوٹے یا بڑے دنوں میں واقع ہوتے ہیں، تو یا تو وہ مختلف ملکوں میں ہمیشہ کے لئے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لئے آرام دہ ہیں، اسلام نے روزوں کی تاریخیں قمری مہینوں سے دیں، جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، اس لئے بہ آسانی روزہ کا مہینہ ہر ملک میں ہر موسم میں آتا ہے، اور اس بنا پر اس کی سختی و نرمی بدلتی رہتی ہے،

عن انس قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ وضع عن الحامل والمرضع الصوم	حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خدا نے حاملہ اور دودھ پلانے والی سے روزہ اتار لیا،

یعنی رمضان میں روزہ رکھنے سے اگر ان کو اپنی یا بچہ کی جان کا خوف ہو تو روزہ قضا کر کے رفع عذر کے بعد قضا رکھیں،

اور مذہبوں میں روزہ کے ایام نہایت غیر معتدل تھے، یا تو چالیس چالیس روز کا روزہ تھا، یا روزہ کے دنوں میں نقد اور گوشت کے علاوہ ہر چیز تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام نے اس میں بھی توسط اختیار کیا، یعنی روزہ کے اوقات میں تو ہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا، مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹوں کی رکھی،

چینیوں کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے تھے، یہودیوں کے ہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا، اسلام نے صرف صبح سے شام تک کا ایک روزہ قرار دیا،

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی اللَّیْلِ (بقرہ ۲۳)	پھر روزہ کو رات کو ختم کرو

یہودیوں کے ہاں یہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کچھ کھا لیتے کھا لیتے، پھر نہیں کھا سکتے تھے، یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا تھا، عرب میں یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا پی لیتے سو لیتے، سو جانے کے بعد کھانا پینا ناجائز تھا، ابتدائے اسلام میں بھی

یہی نہ ہوتا، ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا، ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا نہیں تیار ہوا
تھا، ان کی بیوی کھانا پکا رہی تھیں، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے، کھانا پک چکا تو ان کی بیوی
کی نا کر بیٹھیں، وہ سو چکے تھے، اس لئے کھانا نہیں کھا سکتے تھے، دوسرے روز پھر روزہ رکھا
دن میں ان کو غش آگیا، اس پر یہ آیت اتری،

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔ (بقرہ ۲۳)

اور اس وقت تک کھاؤ پیو جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز نہ ہو جائے،

ابتدائے اسلام میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں عورتوں کو بھی میاں بیوی کے تعلق
رکھنا منع تھا، لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے
مرتکب ہو جاتے تھے، اس لئے اسلام نے صرف روزہ کی رات تک کے لئے یہ مدت کم
کر دی، اور رات کو اجازت دیدی

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ
اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ
لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ
عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ
تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ
وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ

روزہ کی شب میں بیویوں سے مقاربت
تمہارے لئے حلال کی گئی وہ تمہاری
پوشاک ہیں، اور تم ان کی پوشاک ہو
تھا کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے
تھے، تو اس نے معاف کیا، اب ان
سے ہم بستر ہو، اور خدا نے جو تمہارے

مِنْ قَبْلِكُمْ، ہدایت ملنے کے شکریہ میں روزہ فرض

(البقرہ ۔ ۲۳) کیا گیا تھا، تم پر بھی فرض کیا گیا۔

دین حق کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیم محمدی کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گزشتہ امتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز میں بھلا دیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفادار اور کروڑوں امت اس کو اب تک یاد رکھتی ہے اور اپنے رسول کی پیروی میں آج بھی ایک مہینہ تک ہر سال دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشوں سے اپنے کو پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے۔

شکریہ

یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں ہے بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا شکریہ اور اس کی احسان شناسی کا اعتراف ہے، وہ کتاب الٰہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایت ربانی جو رمضان میں انسانوں کو عنایت ہوئی، جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور حیوانی سے انسانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو عروج کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے، ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے، اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا، جس نے ان کی قسمتوں کے پانسے الٹ دیئے، دین و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا، جس نے ذرہ بے مقدار کو آفتاب اور مشت خاک کو ہمدوش ثریا بنا دیا، قرآن پاک اپنے ان لفظوں میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ	اور یہ رمضان کا روزہ اس لئے فرض
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔	ہوا تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے
(بقرہ ۲۳)	ہدایت دی اور تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرو

اس ہدایت ربانی اور کتاب الٰہی کے عطیہ پر شکر گذاری کا یہ اظہار ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں، اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عیدگاہ جاتے ہیں، اور خوشی اور مسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں۔

روزہ اور تقویٰ روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے، جو محمد رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ فرمایا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ	اے ایمان والو، تم پر بھی اسی طرح
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ	روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔	پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا، تاکہ تم تقویٰ
(بقرہ ۲۳)	حاصل کرو

تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی، اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو، بات یہ ہے کہ انسان کے دل میں گناہوں کے اکثر جذبات بہیمی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہیں، روزہ انسان کے

جذبات کی شدت کو کم کرتا ہے۔ اسی لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن نوجوانوں کا علاج جو اپنی مالی مجبوریوں کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، اور ساتھ ہی نفس پر بھی قابو نہیں رکھتے، روزہ بتایا ہے، اور فرمایا ہے کہ روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لئے بہترین چیز ہے۔[1]

۲۔ اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی مشروعیت میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خاص شعور ہے کہ ہمیں کم از کم ایک مہینہ ہر مسلمان کو اس طرح بسر کرنا چاہیئے کہ دن رات میں ایک وقت ہی کھانا کھائے، اور جو ایک وقت کا کھانا بچے وہ اپنے محتاج اور غریب بھائیوں کو کھلا دے۔ ان تمام احکام پر نظر ڈالیے جو فدیہ اور کفارے سے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا کہ ان مواقع میں روزہ کا بدل غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبوں کو کھانا کھلانا، یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں۔ ایسے لوگ جو نہایت کمزور اور دائم المرض یا بہت بڈھے ہیں، اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، ان کو روزہ کے بجائے حکم ہوتا ہے:

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ	اور جو لوگ بمشکل سے روزہ رکھ سکتے
طَعَامُ مِسْكِينٍ (بقرہ ۲۳)	ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں

حج میں اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے

فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ	تو روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ دے

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم

فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا (مجادلہ)   تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا،

ان احکام سے بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت صدقہ و خیرات، غریبوں کے کھلانے بلکہ غلاموں کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے،

۳- روزہ ہی امیروں اور پیٹ بھروں کو بتاتا ہے، کہ فاقہ میں کیسی اذیت اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے، اور اسی وقت ان کو اپنے غریب اور فاقہ زدہ بدحال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقموں سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے، جو خود بھوکا نہ ہو، اس کو بھوک کی، اور جو خود پیاسا نہ ہو اس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیونکر ہوگا، بقول حافظ ابن قیم سوز جگر کے سمجھنے کے لئے پہلے سوختہ جگر بننا ضروری ہے، روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار، رحم اور ہمدردی کے جذبات کو بیدار کرتا ہے چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت بادِ رواں کی طرح ہوتی تھی،[1] اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے یہاں اس مہینہ میں غریبوں اور فقیروں کی امداد و اعانت کی جاتی ہے، اور ان کو شکم سیر کیا جاتا ہے،

۴- انسان کو کتنا ہی نعمت و ناز کے گہواروں میں پلا ہو، اور مال و دولت سے مالا مال ہو، تاہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی اور سختیوں کا خوگر بنائے، جہاد کے موقع میدان کے لئے، بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر و ضبط سے بڑھ کر [illegible] کی ضرورت ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدانِ جنگ

۱؎ صحیح بخاری باب بدء الوحی،

میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے، دوسرا نہیں کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے، جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مرتبہ کرائی جاتی ہے، کہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے، اور دنیا کی کشمکش، جد و جہد، سختی و محنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے، اسی لئے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی "صبر" کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے، تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے۔

۵- جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے، اسی طرح کہیں زیادہ حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں کا نشانہ بنا دیتا ہے، طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ کثرت حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لئے ضروری ہے، مختلف بیماریوں کا یہ فطری علاج ہے، طبی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا ناغہ کیا جائے، اسلام میں ہفتہ وار مسنون و مستحب روزے بھی ہیں، مگر اسی کے ساتھ سال میں ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کیلئے فرض روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے، جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہیں، ان کو ذاتی تجربہ ہوگا کہ یہ ایک مہینہ روزہ کتنی بیماریوں کو دور کر دیتا ہے، بشرطیکہ انہوں نے خود کھانے پینے میں افراط و تفریط بے اعتدالی نہ کی ہو، اس لئے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہے۔

۶- انسان اگر اپنے دن رات کے مشاغل اور مصروفیتوں پر غور کرے، تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک چہارم حصہ کھانے پینے اور اس کے اہتمام میں صرف ہو جاتا ہے، اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا کم کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ

جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جا سکتا ہے، اگر ہمیشہ نہیں تو کم از کم سال میں ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کرکے یہ سعادت حاصل کی جائے،

۷۔ انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لئے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل و دماغ تبخیر معدہ کی عیبت سے پاک ہو۔ چنانچہ بڑے بڑے کابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ صادق ہے،

۸۔ روزہ بہت سے گناہوں سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے، اس لئے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے، چنانچہ اوپر جہاں روزہ اور خیرات کی یکسانی، اور باہم بدلے ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہوں اور خطیات کا کفارہ بھی ہے بلکہ تورات میں تو اس کو نام ہی کفارہ کہا گیا ہے، اور اسلام میں بھی بہت سے موقعوں میں یہ کفارہ بتایا گیا ہے، چنانچہ اگر قسم کھا کر کوئی اس کو توڑنے کا گناہ کرے، تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، اگر اس کی سکت نہ ہو:

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ	تو تین دنوں کے روزے، یہ تمہاری
كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ	قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھاؤ
وَاحْفَظُوْا اَيْمَانَكُمْ (مائدہ)	اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو،

۹۔ حج کی حالت میں شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے اور چند مسکینوں کو کھانا [illegible]

ج۔ بخاری۔ ۳۰ [illegible] تک و ۲۳ و ۲۷،

روزہ امت کے احساس کے لئے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے اور نیکی اور نیک کاموں کے لئے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو بھڑکاتا ہے، یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ متبرک عبادتوں اور نیکیوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے، اسی میں تراویح ہے، اسی میں اعتکاف رکھا گیا ہے، اسی میں زکوٰۃ کا دینا مستحب ہے اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی تو گو سدا بہار تھی لیکن رمضان کے موسم میں وہ تیز ہوا سے بھی زیادہ تیز ہو جاتی تھی[۱]۔

ان ہی باتوں کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے، اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے، اگر روزہ دار روزہ کی یہ غرض و غایت حاصل نہ ہو تو کہنا چاہیے کہ گویا روزہ ہی نہیں رکھا گیا، یا یوں کہنا چاہیے کہ جسم کا روزہ ہو گیا لیکن روح کا روزہ نہ ہوا، اسی کی تشریح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں فرمائی کہ "روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے، تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے[۲]"۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے، تو جو روزہ رکھے اس کو چاہیے کہ لغو اور فحش باتیں نہ بکے اور جہالت (غصہ) نہ کرے، یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے پر آمادہ ہو اور گالی بھی دے

۱ صحیح بخاری باب کیف کان بدء الوحی ص ۳۔ ۲ صحیح بخاری [illegible] ص ۵۵ [illegible]

[illegible]

تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں[۱] بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا "روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کر دو"[۲] صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ یہ سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے، فرمایا "جھوٹ اور غیبت سے"[۳] چنانچہ بعض علماء کی رائے ہے کہ جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے[۴]

۱۱۔ تمام عبادات میں روزہ کو تقوی کی اصل و بنیاد اس لئے بھی قرار دیا کہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے جو ریا اور نمائش سے بری ہے جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے، دوسروں پر اس کا راز افشا نہیں ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاص کی بنیاد ہے،

۱۲۔ اسی مخفی اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ "بندہ میرے لئے اپنا کھانا پینا اور لذت کو چھوڑتا ہے، اس لئے

الصوم لی وانا اجزی بہ[۵] روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا،

جزا تو ہر کام کا وہی دیتا ہے لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا، اور بعض علماء کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے،

---

۱ صحیح بخاری کتاب الصوم جلد ۱ ص [illegible] و صحیح مسلم کتاب الصوم جلد [illegible] ص ۲۰۷ نسخہ نووی [illegible]

۲ سنن دارمی ص ۲۰۸ [illegible] بحوالہ نسائی ص [illegible] ۳ مجمع الزوائد بحوالہ طبرانی [illegible]

۴ فتح الباری جلد ۴ ص ۹۰ ۵ صحیح بخاری و موطا وغیرہ کتاب الصوم،

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ — صبر کرنے والوں کو اُن کی مزدوری بے حساب

بِغَيْرِ حِسَابٍ (زمر-٢) — پوری کی جائے گی۔

اور ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے، اس لئے روزہ دار بھی "صابرین" کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

٣- روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صبر و تحمل و برداشت کی مشق و ورزش کی ایک بہترین و آسان ترین صورت ہے، اس لئے مشکلات کے حل کرنے کے لئے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے،

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ — اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعہ

(البقرة ٥) — مدد حاصل کرو،

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے، لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں، کیونکہ قدرتی مشکلات و مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں، اس لئے اس کی مہارت و مشق کے لئے شریعت نے روزہ مقرر کیا ہے، اسی لئے اس آیت پاک کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی لئے گئے ہیں¹،

٤- یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمال حسنہ میں ہے جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطا پوشی، گناہوں کی معافی اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد ہے،

... وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ — ...... اور روزہ دار مرد اور روزہ دار

---

¹ تفسیر ابن جریر تفسیر آیت مذکور جلد اص ٢٦ - مصر

وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَ	عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت
الْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللهَ	کرنے والے اور حفاظت کرنے والی عورتیں
كَثِيرًا وَّالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللهُ	اور خدا کو زیادہ یاد کرنے والے اور یاد
لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِيمًا	کرنے والی عورتیں، اُن کے لئے اللہ نے
(احزاب - ۵)	تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری'

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرموں کا کفارہ ہے، اسی طرح ہمارے روحانی گناہوں کا بھی کفارہ ہے،

حج

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ (آلِ عمران)

حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے اس کے لغوی معنی قصد اور ارادہ کے ہیں، اور اس سے مقصود کسی مذہبی قصد و ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر وہاں کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے،

انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل خاندان اور خانوادہ کی صورت میں تھی، اس کے آگے بڑھی تو چند خیموں اور جھونپڑیوں کی ایک مختصر سی آبادی بنی پھر وہ شہر کی صورت میں منتقل ہوئی، اس سے ترقی کرکے اس نے ایک قوم اور ایک ملک کا قالب اختیار کیا اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھا گئی۔

مکہ اس انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے، وہ حضرت

ابراہیم خلیل اللہ کے عہد میں ایک خاص خاندان کی بستی مستقر بنا، پھر حضرت اسمٰعیل کے زمانہ میں وہ چند خیموں اور جھونپڑیوں کی مختصر سی آبادی کی صورت اختیار کر گیا، پھر رفتہ رفتہ اس نے عرب کے مذہبی شہر کی جگہ حاصل کی۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز قرار پایا،

دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے مخصوص احاطہ میں دو خاص مکان بنائے جاتے تھے، ایک اس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ، اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا۔ عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی حفاظت اور پناہ میں ہوتی تھی، اور اسی محافظ دیوتا یا ستارہ کی وہاں پوجا ہوتی تھی، اس معبد کا صحن دارالامن ہوتا تھا، نذرانہ کی تمام رقمیں اور پیداوار یہیں آکر جمع ہوتی تھیں، اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی بڑھتی جاتی تھی اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا،

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا جہاں کلدانیوں کی آبادی اور حکومت تھی، یہاں بھی بدستور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی حضرت ابراہیم نے نبوت پاکر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی، اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں نے ان کو اس کے لیے تکلیفیں دیں، اور بالآخر ان کو اپنا وطن چھوڑ کر شام اور مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی، یہ تمام وہ مقامات تھے جن میں سام کی اولاد آباد تھی اور تمدن

ت تورات اور بابل، کلدان، نینوا وغیرہ کی پرانی تاریخی تحقیقات قدیمہ میں سے شمو
میں لگے، اور میری تصنیف ارض القرآن میں ان کے اقتباسات مذکور ہیں

میں دین حق کو پھیلا سکتی تھی،

بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دستور یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا، وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا دیتے تھے، چنانچہ توراۃ کتاب پیدائش میں ان کی تین قربان گاہوں یا خدا کا گھر بنانے کے واقعات مذکور ہیں،

"تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کے کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لئے جو اس پر ظاہر ہوا، ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا، بیت ایل اس کے پچھم اور عئی اس کے پورب تھا، اور وہاں اس نے خدا کے لئے ایک قربانگاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا" (۱۲-۷،۸)

اس کے بعد ہے،

"اور وہ (ابراہیم) سفر کرتا ہوا دکھن سے بیت ایل میں اس مقام تک پہنچا جہاں اس نے شروع میں ایک قربانگاہ بنائی اور وہاں ابراہیم نے خدا کا نام لیا" (۱۳-۴)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہاں ان کو خدائی وحی اور برکت کا پیام پہنچا، اور حکم ہوا،

"اٹھ اور اس ملک کے طول و عرض میں پھر کہ میں اسے تجھ کو دوں گا، اور ابراہیم نے اپنا ڈیرہ اٹھایا، اور ممرے کے بلوطوں میں جو حبرون میں ہیں جا رہا اور ایک قربانگاہ بنائی"، (۱۳-۱۷-۱۸)

اسی قسم کی قربان گاہیں اور خدا کے گھر، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ، اور حضرت موسیٰ نے بھی بنائے اور آخر حضرت داؤدؑ، اور حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کی جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ قرار پایا، حضرت اسحاقؑ کے حال میں ہے، کہ جہاں اُن پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی،

"اور اس نے وہاں مذبح بنایا، اور خداوند کا نام لیا اور وہاں اپنا خیمہ کھڑا کیا اور وہاں اسحٰق کے نوکروں نے کنواں کھودا۔" (پیدایش ۲۶-۲۵)

حضرت یعقوبؑ کو جہاں مقدس رویا ہوئی، وہاں،

"اور یعقوب صبح سویرے اٹھا اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا کھڑا کیا اور اس کے سر پر تیل ڈالا، اور اس مقام کا نام بیت ایل رکھا اور یہ پتھر جو میں نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا، اور سب میں سے جو تو مجھے دے گا، دسواں حصہ (عشر) تجھے (خدا کو) دوں گا۔" (۲۸-۱۹-۲۲)

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے،

"اور اگر تو میرے لئے پتھر کی قربان گاہ بنائے تو تراشے ہوئے پتھر کی مت بنائیو کیونکہ اگر تو اس کے لئے اوزار لگائے گا تو اسے ناپاک کرے گا اور تو میری قربانگاہ پر سیڑھی سے ہرگز مت چڑھیو، تاکہ تیری برہنگی اس پر ظاہر نہ ہو۔" (خروج ۲۰، ۲۵، ۲۶)

حضرت موسیٰؑ نے خدا کے حکم کے بموجب

"اور پہاڑ کے تلے ایک قربانگاہ، اور بنی اسرائیل کے بارہ ۱۲ فرقوں کے لئے بارہ

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ	جب اس کے خدا نے اس سے کہا کہ
أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ،	کو سپرد کردے، اس نے کہا میں نے
(بقرة - ١٦)	کو دنیا کے پروردگار کے سپرد کردیا
يَا إِبْرَاهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ	اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر
الرُّؤْيَا، إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي	دکھایا، ہم یونہی نیک کام کرنیوالوں
الْمُحْسِنِيْنَ، (صٰفّٰت - ٣)	کو بدلہ دیتے ہیں،

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہیں،

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى	خدایا تو محمد اور محمد کی جسمانی و روحانی
اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ	نسل پر برکت نازل کر جس طرح تو نے
وَعَلٰى اٰلِ إِبْرَاهِيْمَ،	ابراہیم اور ابراہیم کی جسمانی و روحانی
	نسل پر برکت نازل کی،

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ نقش خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی، بلکہ روح اور دل کی
قربانی تھی، یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی، یہ اپنی عزیز ترین متاع
کو خدا کے سامنے پیش کردینے کی نذر تھی، یہ خدا کی اطاعت عبودیت، اور کامل بندگی کا بے مثل
نمونہ تھا، یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ امتحان تھا، جسکو پورا کئے بغیر دنیا کی پیشوائی اور امامت
نہیں مل سکتی، یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کردینا نہ تھا، بلکہ خدا کے سامنے
اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمناؤں، اور آرزوؤں کی قربانی تھی، اور خدا کے حکم

کہ انہوں نے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دیا تھا۔ اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس، اور اس خورشیدِ حقیقت کا ظلِّ مجاز تھا۔

اسلام اور قربانیت۔ اسلام کے لفظی معنی اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا، اور اطاعت اور بندگی کے لئے گردن جھکا دینا ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہم السلام کے ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان باپ بیٹوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو صحیفۂ محمدی میں اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ (صٰفّٰت - ۳)	جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اسلام لائے یعنی باپ بیٹے نے خود کو خدا کے سپرد کر دیا اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسماعیل) کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا،
وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ، وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ، وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ، اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (بقرہ - ۱۶)	اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کریگا لیکن جو خود بیوقوف ہے ہم نے اس کو دنیا میں مقبول کیا، اور وہ آخرت میں بھی نیکوں میں سے ہوگا جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لا یعنی فرمانبرداری کر یعنی اپنے کو سپرد کر دے، اس نے کہا میں نے پروردگارِ عالم کی فرمانبرداری کی یعنی [illegible]

بہرحال جس قدر بھی پیشی یا بعد کی گمراہیوں کے سبب اس میں بعض مشرکانہ رسوم کی آمیزش ہوگئی
تھی، تاہم حالت یہ تھی کہ عرب میں بت پرست بھی تھے، ستارہ پرست بھی تھے، کافر بھی تھے،
مشرک بھی تھے بلکہ عیسائی بھی تھے، اور یہودی بھی تھے، مگر عربوں کے قدیم شعارات ثابت ہیں کہ
ان سب کو خانہ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکساں اعتراف تھا، یہاں تک کہ عیسائی
عرب بھی اسی کی قسمیں کھاتے تھے، ورنالبابی دہت کہ خانہ کعبہ میں جہاں مشرکوں کے
بتوں کی صفیں تھیں، حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں بھی تھیں۔[1]

مکہ اور کعبہ: کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمانوں کے خیال کے مطابق عرش الٰہی کا سایہ اور
اس کی رحمتوں اور برکتوں کا سمت القدم ہے، وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کی معبد توحید
کا مرکز تھا، سب سے بڑے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی، اور بیت المقدس سے پہلے اپنی
عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا کہ

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (آل عمران ۔ ۱۰) سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا۔

وہ وہی تھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بے نشان
کر دیا تھا، حضرت ابراہیمؑ کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدہ میں توحید کا چراغ
پھر روشن کیا تو حکم ہوا کہ اس کھوئی ہوئی دیواریں بلند کرکے دنیا میں توحید کا پتھر نصب کیا جائے
چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق (حج ۳-۴) کعبہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی البیت
العتیق یعنی پرانا گھر، تھا کوئی نیا گھر نہ تھا، حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے مل کر اس

---

[1] خبر مکہ ازرقی، و فتح الباری ابن حجر ذکر ہدم اصنام کعبہ، و سیرت ابن ہشام۔

لغوی دلیل ہے، دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی
اور یہ اس خانۂ کعبہ کی قدامت، اور قدماء اور اہلِ عرب کی روایات کی صحت پر دلیلِ قوی ہے
مکہ کا بکہ نام حضرت داؤد کی زبور میں سب سے پہلے نظر آتا ہے، پہلی جلد کے مقدمہ میں اس کا حوالہ گذر چکا
ہے یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان میں "بک" کے معنی آبادی یا شہر کے ہیں جیسا
آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے، بعل کا شہر (بعل دیوتا کا شہر)
یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے، اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی
نام قرآن پاک میں آیا ہے،

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ — پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لئے
لَلَّذِي بِبَكَّةَ (آل عمران ۱۰) — بنایا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے،

کعبہ کے لغوی معنی "چوکھونٹے" کے ہیں چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا اور اب بھی اسی طرح
ہے، اس لئے کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا،

یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے، یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس جو حضرت
عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے گذرا ہے وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے،

ثمودیوں اور سبائیوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے جس کی تمام عرب
بہت بڑی عزت کرتے ہیں[1]

اور ثمود کا مقام شام و حجاز کے حدود میں تھا، اور سبا کا یمن میں، اس سے ظاہر ہے کہ یہ حدود

---

[1] گبن کی تاریخ عروج و زوال روم باب ۵۰،

کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشوں میں یہاں تک کہ یمن و بحرین تک میں پہنچ
میں کامیابی ہوئی، کیونکہ حج کے موسم میں عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی میں اس موروثی رسم کو
ادا کرنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے،

حج ابراہیمی یادگار ہے

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا، اور اس پر لبیک
کہا تھا، اور جس کی تعمیل کے لئے وہ اس دور دراز مقام میں آئے تھے، اور عین اس وقت جب
چھری لے کر بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنا چاہا تھا، اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سن کر گردن جھکا دی
تھی تو آواز آئی تھی،

أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ — یہ کہ اے ابراہیم، تو نے اپنا خواب سچ
الرُّءْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي — کر دکھایا، ہم ایسے ہی نیکوکاروں کو
الْمُحْسِنِينَ .... وَفَدَيْنَاهُ — بدلہ دیتے ہیں.... اور ایک بڑی قربانی
بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (صفت - ۳) — دیکر ہم نے اس کے بیٹے کو چھڑا لیا

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید
کی دعوت کے لئے مخصوص کر دینا اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کو دائرۂ ارضی میں توحید
کا مرکز بنانا ہے،

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ — اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے
وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ — مرجع اور امن بنایا، اور (کہا کہ) ابراہیم
إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَا إِلَىٰ — کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ

إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ أَنْ طَهِّرَا	اور ابراہیم و اسماعیل سے عہد
بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَ	لیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف
الرُّكَّعِ السُّجُودِ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ	اور قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے
رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ	والوں کے لئے پاک کرو، اور یاد کرو جب
ارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ	ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار
مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	اس کو امن والا شہر بنا اور اس کے
الْاٰخِرِ ط قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ	بسنے والوں کو کچھ پھلوں کی روزی
قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلٰى عَذَابِ	دے، جو ان میں سے خدا اور پچھلے دن
النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ وَإِذْ	پر ایمان لائے، خدا نے کہا، اور جس نے
يَرْفَعُ إِبْرٰهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ	انکار کیا، اس کو تھوڑا فائدہ پہنچاؤں گا،
الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ	پھر اس کو دوزخ کے عذاب کی طرف
مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ	کروں گا۔ اور وہ کتنی بری بازگشت ہے
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ	اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسمٰعیل اس
وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً	گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، اور یہ
لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ	دعا مانگ رہے تھے کہ ہمارے رب!
عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ	ہماری اس تعمیر کو) ہم سے قبول فرما
الرَّحِيمُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ	بے شک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے

رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ
الْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ وَمَنْ يَّرْغَبُ
عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا مَنْ
سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ
فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ
لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ اِذْ قَالَ لَهٗ
رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ

(البقرہ [illegible])

اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا ایک
[illegible] اور ہم کو
حج کے ارکان دکھا، اور ہم پر اپنی رحمت
رجوع کر، (ہماری توبہ قبول کر) تو توبہ
قبول کرنے والا اور رحم والا ہے۔ اے ہمارے
رب! ان میں ان ہی میں سے ایک کو
رسول بنا کر بھیج، جو ان کو تیری آیتیں
سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم
دے اور ان کو پاک وصاف بنائے بیشک
تو غالب اور دانا ہے۔ اور ابراہیم کے
دین سے کون منہ پھیریگا، بجز اس کے
جو اپنے آپ کو نادان بنائے گا۔
ہم نے اس کو (ابراہیم کو) دنیا میں چنا
اور آخرت میں وہ نیکوکاروں میں سے
ہوگا، یاد کرو، جب اس کے رب نے اس
سے کہا کہ تابعدار (مسلم) بنجا، اس نے
کہا میں سب جہانوں کے رب کا تابعدار ہوں

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ
الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا
وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَ
الْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ وَ
أَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ
رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ
يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ
لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ
يَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ
مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ
مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا
مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ
ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا
نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ
الْعَتِيقِ ذَٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ
حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ
عِنْدَ رَبِّهِ (حج - ۴)

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لئے
اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا کہ کسی
کو میرا ساجھی نہ بنانا، اور میرے گھر
کو طواف، قیام، اور رکوع اور
سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک کرنا اور
لوگوں میں حج کا اعلان کر دے وہ تیرے
پاس پیادہ اور دور کے سفر سے تھکی ماندی
دبلی سواریوں پر، ہر دور دراز رستے سے
آئیں گے، تاکہ وہ اپنے نفع کی چیزوں
پر حاضر ہوں، اور ہم نے ان کو جو
جانور روزی دیے ہیں ان کی قربانی
پر چند جانے ہوئے دنوں میں خدا کا نام لیں
تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال
فقیر کو کھلاؤ، اس کے بعد اپنا میل کچیل دور کریں
اور اپنی منتیں پوری کریں اور اس قدیم
گھر کا چکر لگائیں، یہ سن چکے اور جو کوئی
خدا کے ادب کی بڑائی رکھے تو وہ اس کے لیے

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ	کہہ کہ خدا نے سچ فرمایا، تو ابراہیم کے
اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ	دین کی پیروی کرو، شرک سے منہ
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ	موڑ کر، اور ابراہیم مشرکوں میں نہ تھا
وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ	بیشک وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنا
مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ	گیا، وہی ہے جو مکہ میں ہے، بابرکت اور
فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ	دنیا کے لیے راہ نما، اس میں کچھ کھلی
وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا وَ	ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کے کھڑے
وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ	ہونے کی جگہ اور جو اس میں داخل ہو
مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا	وہ امن پا جائے، اور خدا کا لوگوں پر
وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ	اس گھر کا قصد کرنا فرض ہے جس کو
الْعٰلَمِيْنَ ۔	اس کے راستہ (سفر) کی طاقت ہو
	اور جو (اس قدرت کے باوجود)
	اس سے باز رہے، تو خدا دنیا والوں
(آل عمران ۔۔۔)	سے بے نیاز ہے،

یہ وہ آیتیں ہیں جن کا تعلق اس موضوع سے ہے، ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکوں سے ہٹا کر حق بنا وہ سرگرداں پھر رہے تھے، اور ایک امن کے سنسان مقام کی تلاش میں تھے تاکہ

دو خدائے واحد کی پرستش کے لئے ایک گھر بنائیں۔ یہ جگہ خاص بیت اللہ کی جو ازل سے اسی کام کے لئے منتخب تھا، تاکہ وہ یہاں خدا کے گھر کی منہدم چہار دیواری کو کھڑی کریں، اور پھر اس کو توحید کا مرکز اور عبادت گذاروں کا مسکن بنائیں

یہ مقام ویران تھا اور پیداوار سے خالی تھا، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی کہ خداوندا یہاں تیرے مقدس گھر کے پڑوس میں اپنی اولاد بساتا ہوں، اُن کو روزی پہنچا، اور لوگوں کے دلوں کو مائل کر تاکہ وہ ادھر آتے رہیں، اور ان کو اس لئے بساتا ہوں تاکہ وہ آس پاس کی بُت پرست قوموں کی بُت پرستی سے بچے رہیں، اور تیری خالص عبادت کریں، ان میں جو نیکوکار ہوں وہ نیک رہیں، اور جو بدکار اور گمراہ ہوں ان کو تو نیک بنا، تو قادر اور معاف کرنے والا ہے، اور خداوندا، تیری اولاد میں ایک رسول بھیج جو ان کو نیک تعلیم دے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس مقام اور اس گھر میں حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی یادگار نشانیاں ہیں، اور اُن کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ، اور قربانی کا مذبح ہے اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ دور دور سے یہاں آئیں اور سیدھے دینی و دنیاوی آلائشوں کو الگ کریں اور اس قدیم خانۂ خدا کا طواف کریں، اور یہاں حضرت اسمٰعیلؑ کی یادگار میں قربانی کرکے غریبوں کو کھلائیں، اپنی نذر پوری کریں، اور اس حالت میں وہ امن و صداقت کے مجسم پیکر ہوں نہ وہ کسی پر ہتھیار اٹھا سکتے ہوں، نہ کسی چیونٹی تک کو دکھ دے سکتے ہوں اور وہ اس حالت میں ظاہری زیبائش و آرائش اور عیش و آرام اور پُرتکلف مصنوعی زندگی سے بالکل الگ ہوں

قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے
سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس
معاہدہ کو اور عبودیت کے اقرار کو اسی طرح بجا لانا جس طرح دو ہزار برس پہلے یہ دو
خدا کی نوازشوں اور بخششوں سے مالا مال ہوئے یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے یہی روح اور
یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس خیال اور قدیم دستوروں کے مطابق
حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان
دنوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں، وہ خود اپنے کو حضرت اسمٰعیلؑ کی طرح خدا کے حضور میں
نذر کرنے جاتے ہیں، اس لئے اتنے دنوں تک (یعنی احرام کے زمانہ میں) سر کے بال نہ منڈاتے
ہیں، نہ ترشواتے ہیں، دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں،
یعنی نہ خوشبو لگاتے ہیں، نہ سلے کپڑے پہنتے ہیں، نہ سر چھپاتے ہیں، نہ خوشبودار کھانا کھاتے ہیں،
نہ شکار کرتے ہیں، نہ کسی کی جان لے سکتے ہیں، نہ بیوی سے ہم بستر ہو سکتے ہیں، اور اسی
والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام تین دن کے سفر کے گرد و غبار میں
اٹے ہوئے، دوڑتے ہوئے خدا کے گھر میں آئے تھے، آتے ہیں، اور جس طرح حضرت
ابراہیمؑ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبان پر
ہوتا ہے،

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ — میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں
لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ — میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں،

الحمد والنعمة لك والملك لك — خوبیاں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں، اور سلطنت

(صحیح مسلم حج) — تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں،

یہ خدمت کی منادی کا ترانہ، اور یہ توحید کی صدا، ان تمام مقامات اور حدود میں بلند
کرتے پھرتے ہیں، جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے، اور چونکہ وہ اپنے
آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربان گاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں، اس لئے پہلے آپ کو سات دفعہ
اس بیت یعنی بیت اللہ کے چاروں طرف پھر کر تصدق کرتے ہیں، پھر یہاں سے جہاں تک
(صفا سے مروہ تک) حضرت ابراہیمؑ دوڑ گئے تھے کہ مروہ پر پہونچ کر بیٹے کی قربانی کریں گے،
وہاں ہم دوڑتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں، اور گناہوں کی بخشایش چاہتے ہیں، اور عرفات کے
سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر اپنی تمام گذشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے
ہیں، خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں، روتے ہیں، قصور معاف کراتے ہیں، اور آیندہ زندگی
کے لئے خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی، اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہیں، اور یہی
درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے۔[1] یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد، ان بزرگوں کے
نقش قدم، ان کی رہائش کے مقامات، اور تجلیات ربانی کے مناظر، دور دراز سفر اور تہیہ کی محنت
کے بعد، عمر بھر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع، اور لاکھوں بندگانِ خدا کا
ایک ہی وحدت کے رنگ میں، ایک ہی لباس اور شکل و صورت، ایک ہی حالت اور
بندہ ہوتے ہیں، سرشار ایک بے آب و گیاہ اور خشک میدان، اور جلتے ہوئے پہاڑوں کے

[1] ترمذی کتاب الحج باب ما جاء من ادرک الامام بجمع فقد ادرک الحج،

دامن میں اکٹھے ہو کر دعا و مغفرت کی پکار، گذشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم، پچھلی بدکاریوں کا اقرار۔ اور پھر اس حسرت کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ تک بہت سے انبیاؑ اسی حالت اور اسی صورت میں اللہ کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ ایسا روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی۔ پھر اپنی نذر کے دن پورے کر کے اپنی [illegible] حضرت ابراہیم ؑ کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں اور اس وقت اسی اطاعت، اسی فدویت، اسی سرفروشی اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں، جو کبھی اسی میدان میں اسی موقع پر، اور اسی حالت اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی۔ وہ دینی جذبات جو ان حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں، اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیم ؑ کے الفاظ کی صورت میں ادا ہوتے ہیں (صحیح مسلم کتاب الحج):

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي	میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی
فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ	طرف منہ کیا، جس نے آسمانوں کو اور
حَنِيفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ	زمین کو پیدا کیا، موحد بن کر، اور میں
(انعام - ۹)	ان میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں
إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ	میری نماز اور میری قربانی، اور
وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ	میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے

لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ۔ (انعام-۲۰)

جو تمام دنیا کا پروردگار ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے اور میں سب سے پہلے فرمانبرداری (اسلام) کا اقرار کرتا ہوں،

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم و ارکان ہیں۔

حج کی اصلاحات۔ حج کی فرضیت دوسری عبادات سے بالکل مختلف تھی، عام اہل عرب نماز کے اوقات ارکان و خصوصیات سے عموماً نابلد تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعلیم دی، اور بتدریج ان کو ترقی دی، زکوٰۃ ان میں سرے سے موجود نہ تھی اس لئے عام صدقہ اور خیرات کے زمانہ سے زکوٰۃ کی فرضیت تک متعدد منزلیں طے کرنی پڑیں، روزے بھی یوم عاشورہ کے روزے سے رمضان تک مختلف قالب بدلے، لیکن حج عرب کا ایک ایسا قدیم شعار تھا، جس کے تمام اصول و ارکان پہلے سے موجود تھے، صرف اُن کا صحیح طریقہ استعمال بدل گیا تھا، یا اُن میں بعض مشرکانہ رسوم داخل ہو گئے تھے، اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بہ یک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا،

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے،

ا۔ ہر عبادت کی اصلی غرض ذکر الٰہی، طلب مغفرت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے لیکن اہل عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنا لیا تھا، چنانچہ جب تمام مناسک حج سے فارغ ہو چکتے تھے، تو تمام قبائل منیٰ میں آکر قیام کرتے تھے، مفاخرت عرب کا ایک

قومی مفاخرہ تھا اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ ذکر الٰہی کی جگہ اپنے اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاۤءَ كُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا. (بقرہ-۲۵)	جس طرح اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے ہو اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ خدا کو یاد کرو

۲۔ قربانی کرتے تھے تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے کہ خدا کا تقرب حاصل ہو جائے، یہود میں بھی یہ رسم تھی کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربان گاہ پر دیتے تھے اور قربانی کا گوشت جلا دیتے تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ دونوں باتیں مٹا دی گئیں، اور یہ آیت اتری،

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ. (حج-۵)	خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا، اس کے پاس صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کی ضیافت کی جائے اور اس جشن برادری کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے۔

۳۔ اہل یمن کا دستور تھا کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے تو زادِ راہ لے کر نہیں چلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ پہنچتے تو

بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1]،

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (البقرۃ-۲۵) — زادِ راہ ساتھ لے کر چلو، کیونکہ بہترین زادِ راہ پرہیزگاری ہے

۴- قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کر لئے تھے ان کی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے، اس غرض سے خانہ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوتا جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے[2]، ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی، یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبۃً للہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا، اور مرد، مردوں کو اور عورتیں عورتوں کو طواف کیلئے کپڑا مستعار دیتی تھیں، اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے، لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے، ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا[3]، اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف کر دیا، اور یہ آیت اتری

خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف-۳) — ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو

اور ۹ھ کے موسم حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو اس غرض کیلئے بھیجا کہ آئندہ کوئی ننگا ہو کر طواف نہ کرنے پائے، چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا، اور اس وقت سے یہ رسم اٹھ گئی[4]،

---

[1] بخاری جلد ۱ ص ۲۰۰ کتاب الحج [2] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت حمزہ سید الشہداءؓ،

[3] بخاری جلد ۱ ص ۲۲۲ کتاب الحج [4] صحیح بخاری کتاب الحج باب طواف عریان،

۵۔ قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تمام قبائل عرفات جا کر قیام کرتے تھے لیکن وہ خود حدود حرم سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے، اس لئے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے، اسلام نے قریش کے اس امتیاز کا خاتمہ کردیا، چنانچہ یہ آیت اتری،

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ	کوچ وہیں سے کرو جہاں سے تمام
النَّاسُ، (بقرہ۔ ۲۵)	لوگ کرتے ہیں،

۶۔ صفا اور مروہ کے درمیان میں جو وادی ہے، اس میں تیزی کے ساتھ دوڑ کر چلنا ایک مذہبی سنت قرار پاگئی تھی، لیکن اسلام نے اس کو کوئی سنت نہیں قرار دیا، یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی،

۷۔ جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو برائے نام ہی سی رہ گئی تھی، ورنہ اس نے درحقیقت ایک بڑے میلے کی حیثیت اختیار کر لی تھی، جس میں ہر طرف سے قبائل کے لوگ جمع ہوتے تھے، اور وہ سب کچھ ہوتا تھا، جو میلوں میں ہوا کرتا ہے، شعر و شاعری ہوتی تھی، دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھیڑ خانی ہوتی تھی، غرض فسق و فجور کا ہر تماشا وہاں ہوتا تھا، اسلام نے یک لخت ان باتوں کو بند کر دیا، اور حج کو خالص تقویٰ اور ذکر الٰہی کا ایک زمانہ بنا دیا،

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا	پھر جس نے ان مہینوں میں حج کی نیت کی
رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ	تو پھر حج میں نہ شہوت کی باتیں کرنا
فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ	نہ گناہ کرنا، نہ لڑائی جھگڑا کرنا اور جو نیکی

۱؎ بخاری کتاب الحج جلد اول ص ۲۲۰ ۲؎ ایضاً ص ۲۲۳،

يَعْلَمْهُ اللّٰهُ (بقرہ - ۲۵) — کروگے اللہ کو معلوم ہوگی۔

۸- مناسکِ حج کے بعد جو لوگ واپس آتے ہوتے تھے، ان میں دو گروہ ہو گئے تھے، ایک کہتا کہ جو لوگ ایامِ تشریق میں واپس آتے ہیں وہ گناہ گار ہیں۔ دوسرا ان لوگوں کو الزام لگاتا، جو دیر تک وہیں رہتے تھے، چونکہ اُن میں درحقیقت کوئی گروہ گنہگار نہ تھا، اس لئے قرآن مجید نے دونوں کی تردید کی۔

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ — جو شخص جلدی کرکے ایامِ تشریق کے
اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ — دو ہی دنوں میں واپس آیا اس پر بھی
اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى — کوئی گناہ نہیں ہے، اور جس نے دیر کی
اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ
(بقرہ - ۲۵) — اس نے تقویٰ اختیار کیا۔

۹- ایک خاموش حج ایجاد کرلیا تھا یعنی حج کا احرام باندھتے تھے، تو چپ رہتے تھے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی، معلوم ہوا کہ اُس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے، انھوں نے اس کو منع کیا، اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام ہے۔[1]

۱۰- خانہ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے، اور اس کو بڑے ثواب کا کام سمجھتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڈھے کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیادہ پا جا رہا ہے، وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا چلنے کی نذر مانی ہے، ارشاد

[1] بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۴۱،

خدا اس سے بے نیاز ہے کہ یہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے، چنانچہ آپ نے اس کو سواری پر چلنے کا حکم دیا[1]، اسی طرح عورتیں خانہ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا چلنے کی نذر مانتی تھیں، آپ نے ایک سفر میں ایک عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ "خدا اس پریشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا، تم سوار ہو، اور دوپٹہ اوڑھ کر چلو[2]"، اسی سبب سے قربانی کے گھر سے جو جانور لاتے تھے، ان پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے، سوار نہیں ہوتے تھے، چنانچہ ایک بار آپ نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکے ہوئے پیدل جا رہا ہے، فرمایا کہ اس پر سوار ہو، اس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، چنانچہ آپ نے تین بار اس کو اونٹ پر سوار ہونے کی تاکید کی[3]۔

انصار حج کرکے واپس آتے تھے، تو دروازے کی راہ سے گھر میں نہیں داخل ہوتے تھے، بلکہ پچھواڑے سے کود کر آتے تھے، اور اس کو کار ثواب سمجھتے تھے، چنانچہ ایک شخص حج کرکے آیا، اور دستور کے خلاف دروازے سے گھر میں گھس آیا، تو لوگوں نے اس کو بڑی ملامت کی، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی،

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ	گھر کے پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی
مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ	نہیں، بلکہ نیکی صرف اس کی ہے جس نے
اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا	تقویٰ حاصل کیا، اور گھروں میں
(بقرہ-۲۴)	دروازوں کی راہ سے آؤ،

---

[1] ترمذی کتاب النذور والایمان باب فی من یحلف بالمشی ولا یستطیع۔ [2] ترمذی کتاب النذور۔

[3] بخاری جلد ۱ ص ۲۲۹، کتاب الحج، ایضاً ص ۲۴۲۔

تمام عرب صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے، خدا نے جب پہلے خانہ کعبہ کے طواف کا حکم دیا اور صفا و مروہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یہ کوئی جائز فعل ہے؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،[1]

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ (بقرہ-۱۹) فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا.	صفا و مروہ خدا کا شعائر ہیں پس جو شخص حج یا عمرہ کرے، اس کے لئے ان دونوں کا پھیرا لگانا گناہ نہیں ہے،

حج کے ارکان اب ان اصلاحات و ترمیمات کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی، ان کی تفصیل اور ان کی مشروعیت کی مصلحتیں حسب ذیل ہیں،

احرام۔ تمام عبادات اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہو سکتا، نماز کے لئے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے، احرام بھی حج کی تکبیر ہے، احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آجاتا ہے اس لئے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جاتی ہیں، جو دنیوی عیش و نشاط، زیب و زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ ہیں، وہ شکار نہیں کر سکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کے لئے کسی جاندار کی جان لینا بہرحال خود غرضی ہے، بی بی سے متمتع نہیں ہو سکتا کہ یہ نفسانی و شہوانی لذتوں سے احتراز کا وقت ہے، سئے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ و جلال کے اظہار کا ذریعہ ہیں، اس بنا پر اہل عرب

[1] صحیح بخاری کتاب الحج جلد ص ۲۲۳،

برہنہ طواف کرتے، لیکن خدا کی بارگاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی، اس لئے اسلام نے اس کو جائز
نہیں رکھا، اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ و گدا اپنے اپنے سلے ہوئے کپڑوں کو اتار دیں
اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا زیب بر کیا جائے، ایک چادر کمر سے نیچے باندھی جائے
اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لی جائے کہ داہنا ہاتھ ضرورت کے لئے
باہر رہے، یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے، جو اس لئے اس وقت کے لئے پسند کیا گیا
اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل و صورت سے نمایاں ہو، یہ گویا شہنشاہ دو عالم
و عالمیان کے درمیان میں حاضری کی وردی ہے، جو بالکل سادہ بے تکلف، اور زیب و زینت سے
خالی مقرر کی گئی ہے،

طواف۔ یعنی خانہ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر کر دعائیں مانگنا، اس رسم کو
ادا کرتا ہے، جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں نذر اور قربانی کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھرا
کر ادا کی جاتی تھی، چونکہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے ...... اس لئے وہ اس کے
چاروں طرف پھرتا ہے، اور اس گردش کی حالت میں وہ اپنی مغفرت کی دعائیں سچے دل سے
مانگتا ہے، جس کا ایک ٹکڑا آخر میں یہ ہوتا ہے، کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ
حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ "خداوندا ہم کو دنیا میں نیکی دے، اور آخرت میں نیکی دے
اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا"

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے، جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے، اسی لئے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ

تم اس میں بول سکتے ہو، مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھ اور نہ بولو۔[1] اور حکم ہوا کہ

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ (حج-۴) اور اس پرانے گھر کا طواف کریں

حجر اسود کا استلام۔ حجر اسود کے لفظی معنی کالے پتھر کے ہیں، یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے، جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قد آدم بلند لگا دیا گیا ہے، خانہ کعبہ بیسیوں دفعہ گرا، اور بنا، کبھی سیلاب میں بہ گیا، اور کبھی آگ میں جل گیا، اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں پڑی تھی، ایک پتھر بھی اب تک باقی نہیں، مگر اس عہد عتیق کی یادگار صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا، جس کو اہل عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا، اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے، (الا یہ کہ ۳۱۷ھ میں باطنیہ اس کو کھود کر نکال کر لے گئے، وہ پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا، اور اسی لئے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے، اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے، اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کے لئے وہ ایک نشان کا کام دے۔ ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دیتے ہیں، سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں، اور ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں، یہ نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ پر بھی قناعت کر سکتے ہیں، یہ پتھر کچھ نہیں تو ایک تاریخی پتھر ہے، جس میں نہ کوئی آسمانی کرامت ہے، نہ کوئی غیبی طاقت ہے، صرف

---

[1] ترمذی، نسائی، دارمی و مستدرک حاکم۔

یہیں جبلِ رحمت کے اوپر کھڑے ہوکر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبۂ عام دیتا ہے، اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ عرفات کے اس وقوف میں جہاں ایک طرف تو اسلام کی شان وشوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے، اور دوسری طرف یہ اجتماعِ عظیم روزِ حشر کی یاد دلاتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ سورۂ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے، یہ اجتماع، اور اس کا یہ نہایت مؤثر منظر دلوں میں مغفرت اور رحمتِ الٰہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے۔ ہر شخص کو دیکھئے بس آگے پیچھے دور تک یہی منظر آتا ہے، تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔

قیامِ مزدلفہ۔ حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے۔ عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے، اسی حالت میں اگر منیٰ کو برابر دوڑتے چلے جاتے تو راستہ کی خستگی سے چور ہو جاتے۔ اس لئے انھوں نے ذرا سکون اور آرام لینے کے لئے مزدلفہ کو بیچ کی منزل قرار دے دیا تھا۔ اسلام نے اس کو اس لئے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعرِ حرام کہتے ہیں، اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا، اس لئے عرفات سے شام کو واپس آکر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوعِ فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا۔

فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْ	تو جب عرفات سے چلو تو مشعرِ حرام کے
كُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ	پاس خدا کو یاد کرو، اور اس کو یاد کرو جس
كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ	طرح اس نے تم کو بتایا، اور تم اس سے
لَمِنَ الضَّالِّينَ (بقرۃ-۲۵)	پہلے حق کی راہ سے بھٹکے ہوئے تھے

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِي أَيَّامٍ	اور ان مقررہ دنوں میں خدا کا نام
مَّعْدُودَاتٍ (ج-۲۵)	یاد کرو

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور الٰہی نشان کے جلوہ گاہ ہیں جہاں پہنچ کر ان کو دیکھ کر ہم کو خدا کی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہیں، اسی لئے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام شعائر اللہ اور حرمات اللہ ہے یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم چیزیں، اور ان ہی شعائر اللہ اور حرمات اللہ کی تعظیم و زیارت کا نام ارکانِ حج ہے، سورۂ حج میں حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے،

وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ فَهُوَ	اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے
خَيْرٌ لَّهُ عِنْدَ رَبِّهِ (حج-۴)	تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک اس کے لئے بہتر ہے

صفا و مروہ کی نسبت ہے،

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ	بیشک صفا و مروہ خدا کے شعائر ہیں
اللّٰهِ (بقرہ-۱۹)	

اور سورۂ حج میں فرمایا،

ذٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ	یہ اور جو اللہ کے شعائر کا ادب کرے
فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (حج ۴)	تو یہ دلوں کی پرہیزگاری سے ہے،

ان آیتوں سے ظاہر ہوگا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب و احترام اور ان سے جو مقدس روایتیں وابستہ ہیں ان کی یاد تازہ رکھنا، اور دلوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا کرنا ہے

کہ خداوندا میں نے اپنی اولاد کو اس بے آب و گیاہ سرزمین میں آباد کیا ہے، تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکا دے، اور ان کے رزق کا سامان کر، اور ان کو پھل کی روزی دینا۔ اللہ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔ اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ یہاں کے بسنے والوں کے لئے زکوٰۃ و خیرات کی کوئی رقم مقرر کی جاتی لیکن یہ ان لوگوں کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہوجاتی، وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوجاتے جو ان کے منصب کی عزت و شرف کے مناسب نہ ہوتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا اور اس کو ان کی روزی کا سامان بنادیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کا اور کہیں پر ان کا تاریخوں میں وجود نظر آتا ہے وہ تجارت اور سوداگری کی حیثیت میں ہی ہے، حضرت یعقوبؑ ہی کے زمانہ میں جو حضرت ابراہیمؑ کے پوتے اور حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے تھے بنی اسمٰعیل کا تجارتی قافلہ مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے (تکوین ۳۷-۲۸) سے مستشرق اور قدیم تاریخ میں عرب سوداگروں اور تاجروں کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے، خود قریش بھی جو زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے جس کا ذکر سورۂ لایلٰف قریش میں ہے وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام اور عراق تک جاتے تھے۔[1]

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی مکہ معظمہ کے بیرونی اسباب کی محتاج تھی اس لئے کافی نہ تھی خود مکہ کی سرزمین کو اور حج کے زمانہ کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کی ایک بڑی منڈی تھا، اور عکاظ وغیرہ کے بڑے بازار لگتے تھے

[1] تفصیل اور حوالوں کے لئے دیکھو میری تالیف ارض القرآن جلد دوم باب تجارت عرب صفحہ ...

اور یہ تمنا بے آب وگیاہ وادی اور اس ملک کے باشندوں کی بہت بڑی مدد تھی۔

ابراہیمی دعا کی مقبولیت | حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا میں خاص طور پر پھلوں کا ذکر کیا تھا

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ	اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں
(البقرہ ۵-۱۵)	سے روزی دینا۔

اس دعا کا یہ اثر ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے بازاروں میں ہر وقت تازہ سے تازہ پھل میوے، سبزی اور ترکاریاں نظر آتی ہیں، اور دعائے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہیں، زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزہ بھی ملنے لگتا ہے۔

تجارت | قرآن پاک کے محاورہ میں "خدا کا فضل تلاش کرنے" سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصول رزق کو بھی قرار دیا ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہے،

وَلَا آمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ	اور نہ ان کو (ستاؤ) جو اس ادب
يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ	والے گھر کے قصد کو جا رہے ہوں،
وَرِضْوَانًا،	اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی
(مائدہ ۱-۱)	تلاش کرتے ہوئے،

یعنی ان کے مال و اسباب کو لوٹنا جائز نہیں کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا،

تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے، لیکن

اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا، یورپ اور امریکہ کی تجارت کا مرکزی
بازار بن رہا ہے۔ اس جنگ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ مختلف ہو گئے ہیں۔

روحانیت: اس سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتیں ہیں جو ان مقامات کی زیارت اور
ارکانِ حج کے ادا کرنے سے قلب اور روح میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی ایک حیثیت تو قومی
دوسری تاریخی، اور تیسری خالص روحانی ہے۔ قومی ہونے کے یہ معنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک
میں رہتے، ہر زبان بولتے، اور ہر لباس پہنتے ہیں، تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے
کہ وہ جسمانی طور سے کہیں ہوں تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے
جو ملتِ ابراہیمی کا مقام، اسلام کا مولد، اور قرآن کا مہبط ہے، اس سے دور دراز ملکوں
سے ولولہ اور شوق کے بازوؤں سے اڑ کر جب لوگ یہاں پہنچتے ہیں تو اس ریگستان
اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی محبت کا سرچشمہ ابلنے لگتا ہے اور ان کے دل میں اسلام کے ابتدائی
قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اسلام اگرچہ ہر جگہ
بھی ہے، اس کو وہاں اسلام اپنے خالص رنگ میں نظر نہیں آتا، ہر جگہ اس کے ساتھ اور چیزیں ملی ہوئی
بھی نظر آتی ہیں، اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب کی رنگ آمیزی دکھائی دیتی ہے، اپنے تمدن
کے ساتھ دوسرے تمدنوں کا بھی منظر سامنے ہوتا ہے لیکن یہاں اسلام اس کو اپنے خالص
رنگ میں جلوہ گر معلوم ہوتا ہے، گرد و پیش، آگے پیچھے، داہنے بائیں، ہر طرف اسلام ہی اسلام
اسلام ہی کا مجسم پیکر دکھائی دیتا ہے، اور اس وقت سرزمین حجاز اور دنیائے اسلام کا مرکز
اس کی نگاہ میں ایسا نظر آتا ہے جس طرح نو آبادیوں کے رہنے والوں کی نگاہ میں انگلستان

کی حیثیت آج انگریز ہندوستان، مصر، فلسطین، اسٹریٹس، جبل الطارق، نیوزی لینڈ، سنگاپور،
آسٹریلیا، ہانگ کانگ، ٹرنسوال، زنجبار، وسط افریقیہ، ورکینیڈا، امریکہ، کے متفرق ملکوں میں آباد ہیں، تاہم
انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ اُن کی نگاہ میں اس وسیع برطانی مملکت کا جس میں آفتاب نہیں
ڈوب ہوتا، مرکز ہے، وہ ان کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے، وہ تمدن، معاشرت، اخلاق،
تعلیم غرض ہر چیز میں اپنے اس آبائی وطن اور مسکن کی پیروی کرتے ہیں جب اُن کی آنکھیں اس کے
دیدار سے مشرف ہوتی ہیں، تو اپنی خالص اور بے میل تہذیب، اخلاق اور تمدن کے گھر کو دیکھ کر
مسرت اور خوشی سے روشن ہو جاتی ہیں، وہ اس کے ایک ایک در و دیوار کو عزت اور عظمت
کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس وقت اُن کے دل میں وہ احساسات پیدا ہوتے ہیں، جو دوسرے
ممالک، غیر وطن اور غیر تمدن میں رہنے کی وجہ سے ان کی افسردہ اور پژمردہ ہو جانے والی
روحوں کی قوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں، اور وہ یہاں آکر اپنی خالص تہذیب و تمدن کے پاک
دامن چشمۂ حیات میں نہا کر نئے سرے سے پھر جوان ہو جاتے ہیں، بلاشبہ اسی قسم کی کیفیت
در حقیقت ان مسلمانوں کی ہے، جو عرب کو اپنا اپنے مذہب کا، اپنی قومیت کا، اپنے تمدن
کا، اپنے علوم و فنون کا مولد و مسکن سمجھتے ہیں، ان میں سے جب کسی کو اس ملک اور اس
کی زیارت کا موقع ملتا ہے، تو اس کا ذرہ ذرہ اس زائر کے دامن دل سے لپٹ جاتا
ہے، اور وہ چلا اٹھتا ہے،

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

یہی منشا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت فرمائی کہ عرب تک

اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا

صحیفہ نہ رہنے دیا جائے، اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرک و کافر اب اس مسجد کے قریب

بھی نہ آنے پائیں، تاکہ یہاں اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک و صاف اور کفر و شرک کی ہر قسم کی

نجاستوں سے محفوظ رہے، تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہاں آکر مسلمان خالص پاکیزگی

اور روحِ ایمانی کو تازہ کر سکیں۔ قرآن پاک نے مکہ معظمہ کو ام القریٰ یعنی آبادیوں کی

ماں کہا ہے، اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل نہیں ہو تو ساری دنیا کی

آبادیوں کی ماں اور اصل و مرجع اور ماویٰ تو ضرور ہے۔

تاریخیت:- اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرم پاک کے

ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے۔ آدمؑ سے لے کر ابراہیمؑ تک اور ابراہیمؑ سے لے کر [illegible]

تک جو کچھ ہوا ہے، اس کا تمام تر تعلق ارضِ حرم سے ہے، کوہ و صحرا اور در و دیوار [illegible]

حضرت آدمؑ نے سکونت کی، اور عرش کے سایہ میں خدا کا گھر بنایا، یہیں حواؑ نے آکر

ملاقات کی، یہیں نوحؑ کی کشتی نے آکر دم لیا، حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے [illegible]

کی، حضرت ابراہیمؑ نے یہاں ہجرت کی، حضرت اسماعیلؑ نے یہیں سکونت اختیار کی، آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ولادت پائی، یہیں وہ پہاڑی ہے (صفا) جہاں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت

اسماعیلؑ کو یہاں چھوڑ کر آئے تھے، یہیں وہ دوسری پہاڑی ہے (مروہ) جس پر باپ بیٹے کی قربانی ہوئی

یہیں وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت ہاجرہؑ کو پیاس کے وقت نظر آیا، یہیں [illegible]

جس کی چار دیواری کو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بلند کیا، یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر انھوں نے خدا کے آگے سر جھکائے، اسی کے قریب منیٰ، مشعر حرام، اور عرفات ہیں، جو شعائر اللہ میں ہیں، وہ پتھر (حجر اسود) ہے جو ابراہیم و اسماعیل اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا، یہی وہ سرزمین ہے، جہاں ملت ابراہیمی کی بنیاد پڑی یہی وہ آبادی ہے جہاں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا یہیں وہ گلیاں اور راستے ہیں، جو جبرئیل امین کے گذرگاہ رہے ہیں، وہ غار حرا ہے، جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی، یہی وہ صحن حرم ہے جہاں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ترپن سال بسر کئے، اور یہی وہ مقام ہے، جہاں ہر قدم پر تاریخ تھی اور یہی وہ مکانات ہیں، جن کی ایک ایک اینٹ، اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے کیا قرآن پاک کا اشارہ ان ہی مناظر اور مشاہد کی طرف نہیں جہاں اس نے کہا،

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ — اس حرم میں کھلی کھلی روشن نشانیاں
(آل عمران) — ہیں، ابراہیم کے قیام کی جگہ۔

ان مقامات اور مناظر میں کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں، اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے، اور محبت ہی کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں تڑپنے لگتی ہے، جدھر نظر اٹھاتی ہے، دل جدھر نگاہیں متوجہ ہوتی ہیں، اور زبانیں تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جاتی ہیں، اور یہی وہ لذت و لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط اور رشتہ کو [illegible] کی محبت کو زندہ کرتا ہے،

عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ،	اپنے حج کے احکام اور دستور سکھا، اور ہم پر رجوع ہو۔ (یا ہم کو معاف کر) تو بندوں کی طرف رجوع ہونے والا (ان کو معاف کرنے والا) اور رحم
(بقرہ - ۱۵)	کرنے والا ہے)

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی اُن کی دوسری دعاؤں کی طرح ضرور قبول کی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ حج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین میں حاضر ہوکر جہاں اکثر نبیوں، رسولوں اور برگزیدوں نے حاضر ہوکر اپنی طاعت اور فرمانبرداری کا اعتراف کیا، اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار ہے، اور ان مقامات میں کھڑے ہوکر اور چل کر خدا کی بارگاہ میں اپنی سیہ کاریوں سے توبہ کرنا، اور اپنے روٹھے ہوئے مولا کو منانا ہے۔ تاکہ وہ ہماری طرف رجوع ہو کہ وہ تو اپنے تائب گنہگاروں کی طرف رجوع ہونے کے لئے ہر وقت تیار ہے، اور وہ رحم و کرم، لطف و عنایت کا بحر بیکراں ہے،

یہی سبب ہے کہ شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح معاف کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے، اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) حرام کی حالت میں گذارتا ہے، اس کا سورج ڈوبتا ہے، تو اس کے گناہوں کو لے کر ڈوبتا ہے[1]"

---

[1] نسائی و ترمذی و بزاز و طبرانی کبیر بحوالہ جمع الفوائد، کتاب الحج جلد اول ص ۱۲۳، میرٹھ۔

صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ بشارت دی کہ عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں، جس میں خدا اپنے بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہو، خدا اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے، اور اپنے ان بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ جو کچھ وہ مانگیں وہ ہم نے قبول کیا، موطا امام مالک میں ہے کہ آپ نے یہ خوشخبری سنائی کہ بدر کے دن کے سوا عرفہ کے دن سے زیادہ شیطان کسی دن ذلیل، رسوا اور غضبناک نہیں ہوتا، کیونکہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے، اور گناہ معاف ہو رہے ہیں، اسی طرح اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں مخصوص طور سے ادا کرنے والوں کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے، یہ تمام حدیثیں درحقیقت اسی دعائے ابراہیمی، وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا "اور ہمارے حج کے دستور ہم کو بتا، اور ہماری توبہ قبول فرما" کی تفسیریں ہیں،

ان تمام بشارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہی کی [illegible] احرام باندھتے ہی لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ "خداوندا میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں" کا زمزمہ اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے، سعی میں، کوہ صفا اور مروہ پر، عرفات میں، مزدلفہ میں، منیٰ میں ہر جگہ جو دعائیں مانگی جاتی ہیں، ان کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے، اور اس بنا پر کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ[1] "گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہیں ہے" اسی لئے حج مبرور والوں کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں،

---

[1] سنن ابن ماجہ باب ذکر توبہ،

گناہ تو بہت ہر جگہ معاف ہوسکتے ہیں، اس لئے کعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہیں
لیکن حج کے مشاعر، مقامات اور ارکان اپنے گوناگوں اثرات کی بنا پر دوسرے فوائد وبرکات
کے علاوہ جو یہاں کے سوا اور کہیں نہیں، صدق توبہ کے لئے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہیں، ان
مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے اس کا نفسیاتی اثر دل پر بہت گہرا پڑتا ہے
وہ مقامات جہاں انبیاء علیہم السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول، اور انوار الٰہی کی بارش ہوئی
وہ ماحول، وہ فضا، وہ تمام گنہگاروں کی ایک جگہ اکٹھا ہوکر دعا وزاری، فریاد وبکا، اور آہ وفغاں
وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد، جہاں خدا اور اس کے برگزیدہ بندوں کے بیسیوں ناز
ونیاز کے معاملات گذر چکے ہیں، دعا اور اس کے تاثر، اور اس کے قبول کے بہترین موقع ہیں جہاں
حضرت آدمؑ وحواؑ نے اپنے گناہوں کی معافی کے لئے دعا کی، جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت
واولاد کے لئے دعا مانگی، جہاں حضرت ہودؑ، اور حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد
اپنی پناہ ڈھونڈھی، جہاں دوسرے پیغمبروں نے دعائیں کیں، جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے کھڑے ہوکر اپنی، اور اپنی امت کے لئے دعائیں مانگیں، وہی مقامات، وہی مشاہد اور
وہی ارکان ہم گنہگاروں کی دعائے مغفرت کے لئے کس قدر موزوں اور مناسب
ہیں، کہ پتھر سے پتھر دل بھی ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں
اور انسان اس ابر کرم کی چھینٹوں سے سیراب ہوجاتا ہے، جو وقتاً فوقتاً یہاں برگزیدگان
الٰہی پر بارش الٰہی برستا رہا ہے "اور ہنوز آن ابر رحمت درفشان ست"
انسانوں کی نفسیات (سائکلوجی) یہ ہے اور روزمرہ کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ دنیا

يفسق رجع كيوم ولدته امه[1]

حج میں جو شہوت رانی نہ کی، اور نہ گناہ کیا تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے جیسے اس دن تھا جس دن ماں نے اس کو جنا،

یعنی ایک نئی زندگی ایک نئی حیات، اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے، جس میں دین و دنیا دونوں کی بھلائیاں جمع اور دونوں کی کامیابیاں شامل ہوں گی، یہ فلسفہ خود قرآن پاک کی ان آیتوں میں واضح ہے جو حج کے باب میں ہیں، اور جس کی آخری آیتیں طواف کی دعا کا آخری ٹکڑا ہیں،

ثُمَّ اَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ
النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيمٌ فَاِذَا قَضَيْتُمْ
مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ
اٰبَاءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا فَمِنَ
النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي
الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ
خَلَاقٍ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّقُوْلُ
رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ
فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ
النَّارِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ

پھر طواف کے لئے وہیں سے چلو، جہاں سے
لوگ چلے، اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی
مانگو، بیشک خدا معاف کرنے والا اور
رحم کرنے والا ہے، اور جب حج کے تمام
ارکان ادا کر چکو، تو اللہ کو اس طرح
یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادوں
کو یاد کرتے ہو، یا اُن سے بھی زیادہ،
تو بعض لوگ (حج کی دعا میں) کہتے
ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم کو
دنیا میں دے، اور ایسوں کے لئے آخرت
میں کوئی حصہ نہیں، اور بعض وہ ہیں جو

[1] سنن ابی داؤد کے علاوہ بقیہ تمام کتبِ صحاح کی کتاب الحج میں یہ حدیث موجود ہے،

وَّمِمَّا كَسَبُوا وَاللّٰهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ (بقرہ-۲۵)

بعض لوگ ایسے ہیں جو

کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے، اور آخرت میں بھی بھلائی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، یہ وہ ہیں جن کو اپنی کمائی کا حصہ ملیگا، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہیں، مثلاً

اس حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس کر سکتا ہے، حج اس وقت فرض ہوتا ہے، جب اہل وعیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے، اس لئے آدمی حج کے لئے اس وقت نکلتا ہے جب اہل وعیال کی ضرورتوں کا سامان کر لیتا ہے، اس لئے اس کو اہل وعیال کے مصارف کی ذمہ داریاں خود بخود محسوس ہو جاتی ہیں، معاملات میں قرض انسان کی گردن پر ہو، اور حج وہی شخص ادا کر سکتا ہے، جو اس سے سبکدوش ہو جائے، اس لئے معاملات پر بھی نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے،

عام طرز معاشرت اور دنیوی کاموں میں آدمی اپنے سیکڑوں دشمن پیدا کر لیتا ہے، لیکن جب خدا کی بارگاہ میں جانے کا ارادہ کرتا ہے، تو سب سے بری الذمہ ہو کے جانا چاہتا ہے، اس لئے رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض و حسد سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے، لوگوں سے اپنے قصور معاف کراتا ہے، دوستوں سے ملتا ہے، قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے، اس بنا پر حج معاشرتی، اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے،

۲۔ مسلمان ہر ملک میں ہیں، اس لئے ہر ملک کی زبان اس کی زبان ہے، تاہم اس کی ایک عمومی زبان بھی ہے جو اس ملک کی زبان ہے جہاں دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہیں، اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر میں کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم خواہ کوئی بھی بولی بولتی ہو، وہ اس ملک کی زبان سے اور زبان سے کسی نہ کسی حد تک واقف ہوتی ہے، اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

۳۔ مساوات اسلام کا سنگِ بنیاد ہے، اگرچہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے، لیکن پوری وسعت کے ساتھ اس کی اصلی نمائش حج کے زمانہ میں ہوتی ہے جب امیر و غریب، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا، ایک لباس میں، ایک صورت میں، ایک میدان میں ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، نہ کسی کے لئے جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے، نہ آگے پیچھے کی قید۔

۴۔ بہت سی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ کسب حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف میں مالِ حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے خود حلال و حرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے، اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

غرض حج اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں، بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی، اور مسلمانوں کی عالمگیر قومی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے۔

"جہاد"

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (حج ۱۰)

عام طور سے اسلام کے سلسلۂ عبادات میں جہاد کا نام فقہا کی تحریروں میں نہیں ہے، قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کی فرضیت و اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام و عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس فریضۂ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دی جائے اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو تو بر تو پردے پڑ گئے ہیں، ان کو اٹھایا جائے۔

"جہاد" کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ یہ لفظ "جہد" سے نکلا ہے۔ جہاد و مجاہدہ، فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں، لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں۔ اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہیں یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت و حفاظت کے لئے ہر قسم کی جدوجہد قربانی اور ایثار گوارا کرنا، اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں، اس راہ میں صرف کرنا، یہاں تک کہ اس کے لئے اپنی، اپنے عزیز و اقارب کی، اہل و عیال کی، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کی مخالفوں اور دشمنوں کی

وَاَنْفُسِہِمْ عَلَى الْقَاعِدِیْنَ	کر بیٹھنے والوں پر درجہ کی فضیلت دی
دَرَجَۃً ط وَکُلًّا وَّعَدَ اللہُ الْحُسْنٰی	ہے، اور ہر ایک کو خدا نے بھلائی کا وعدہ
وَفَضَّلَ اللہُ الْمُجَاہِدِیْنَ عَلَى	کیا ہے، اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے
الْقَاعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا (نساء ۱۳)	والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے۔

ان بیٹھنے والوں اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے
سستی کرنے، اور آرام ڈھونڈھنے کے سراسر خلاف ہی۔

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کرنا ضروری ہی اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد، اور قتال دونوں
ہم معنی ہیں، حالانکہ یہ نہیں ہی قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے
ہیں، اس لیے جہاد فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جہاد کرنا) اور قتال فی سبیل اللہ (خدا کی
راہ میں لڑنا) ان دونوں لفظوں کے ایک معنی نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں میں عام و خاص کی
نسبت ہی یعنی ہر جہاد قتال نہیں ہی بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قتال اور دشمنوں سے
لڑنا بھی ہی اسی لیے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے
چنانچہ اس سورۂ نساء کی اوپر کی آیت میں اور دوسری آیتوں میں جہاد کی دو قسمیں بیان کی
گئی ہیں، جہاد بالنفس، اور جہاد بالمال، یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا، اور اپنے مال کے ذریعہ
جہاد کرنا، جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کے لیے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر قبول کی
جائے، یہاں تک کہ اپنی جان تک دشمنوں میں ڈال دیتے، آگ میں جھونکے جانے، سولی
پر لٹکائے جانے، تیر اور نیزے میں چھید جانے، اور تلوار سے کٹ جانے کے لیے ہر وقت

اور مستعد رہے اور اس بات پر آمادہ رہنا ہے کہ حق کو کامیاب اور سربلند کرنے کے لئے اپنی ہر محبت کو
قربان، اپنی ہر دولت کو نثار، اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لئے تیار رہے، اسی جان
اور مال کی باطل محبت، بخل اور توہم دونوں کی ترقی و سعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے، اگر
یہ دونوں بت ہمارے راستہ سے ہٹ جائیں تو ہم کامل مومن ہو جائیں، اور پھر ہماری
ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی جسمانی و روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے
اس کے سوا کچھ اور نہیں،

ترقی و سعادت کا یہ گر صرف محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بتایا گیا، اور آپ ہی نے
یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا، اسی جذبہ کا جذبہ اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی، جس کے
سبب سے ابتدائی مسلمانوں نے تیرہ برس تک ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیلا اور مقابلہ کیا، ریگستان کی
جلتی دھوپ، پتھر کی مار، گلے میں رسی، زنجیر کی گرانباری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت
نیزوں کی انی، تلوار کی دھار، اہل و عیال سے علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری، وطن عزیز
سے دوری، کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی، اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ
میں انہوں نے جو زندگی بسر کی، لڑائیوں میں جس طرح گذارے، وہ دنیا کو معلوم ہے،

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا — مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے
بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا — رسول پر ایمان لائے پھر اس اور
وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ — میں دو دلگے نہیں، اور خدا کے
فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ — رستہ میں اپنی جان اور اپنے مال سے لڑے

هُمُ الصَّادِقُوْنَ (حجرات-۲)	یہی ہیں سچے کہنے والے لوگ ہیں
فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا	پھر جنھوں نے اپنا گھر بار چھوڑا، اور اپنے
مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ	گھروں سے نکالے گئے، اور میری راہ
سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ	میں ستائے گئے، اور لڑے، اور مارے
عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ	گئے ہیں، ان کے گناہوں کو ان سے دور کر دوں گا
جَنّٰتٍ، الآیہ (آل عمران-۲۰)	اور ان کو بہشت میں داخل کروں گا

جہاد کی قسمیں: ۱- جب جہاد کے معنی محنت، سعی بلیغ، اور جد و جہد کے ہیں، تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہو سکتا ہے، علمائے دل کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے، اور اسی کا نام ان کے ہاں "جہاد اکبر" ہے خطیبؒ تاریخ میں حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے ان صحابہ سے جو ابھی ابھی لڑائی کے میدان سے واپس آئے تھے فرمایا تھا "آنا مبارک تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا ہوائے نفس سے لڑنا ہے" حدیث کی دوسری کتابوں میں اس قسم کی اور بعض روایتیں بھی ہیں، ابن نجار نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے "یہی روایت دیلمی میں ان الفاظ میں ہے کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لیے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو"، یہ تینوں روایتیں گو فن کے لحاظ سے چنداں مستند نہیں ہیں، مگر یہ درحقیقت بعض صحیح حدیثوں کی تائید، اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہیں

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا	اور جنھوں نے ہمارے بارہ میں

لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللّٰهَ	کیا انھوں نے محنت و تکلیف اٹھائی ہم
لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ،	ان کو اپنے رستے دکھا دیں گے، اور بے شبہہ
(عنکبوت - ۷)	خدا نیکوکاروں کے ساتھ ہے،

اس پورے سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کے لئے مصیبت و تکلیف میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے، اور اگلے پیغمبروں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے کہ وہ ان مشکلات میں کیسے ثابت قدم رہے، اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا، سورہ کے آغاز میں ہے،

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ	اور جو کوئی جہاد کرتا ہے، (یعنی محنت
لِنَفْسِهٖ، إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ	اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی نفس کے لئے
(عنکبوت - ۱)	جہاد کرتا ہے، اللہ تو جہان والوں سے بے نیاز ہے،

اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں، یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہد کرے گا، وہ محنت اٹھائے گا ہم اس کے لئے اپنے تک پہنچنے کا راستہ پیدا کر کے اور اس کو راہیں دکھائیں گے، یہی مجاہدہ کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے،

سورۂ حج میں ارشاد ہوا،

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ	اور محنت کرو اللہ میں پوری محنت،
هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ	اس نے تم کو چن لیا، اور تمھارے دین
فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ	میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی تمھارے

أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ، (حج-۱۰) باپ ابراہیم کا دین،

"راہِ اللہ میں محنت اور جہاد کرنا" وہی جہادِ اکبر ہے، جس پر ملتِ ابراہیمی کی بنا ہے، خدا کی راہ میں عیش و آرام، اہل و عیال، اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا، ترمذی جلد اول، اور صحیح ابن حبان میں ہے، کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ سے فرمایا کہ المجاهد من جاهد نفسه "یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے" صحیح مسلم میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے صحابہ سے پوچھا کہ "تم پہلوان کس کو کہتے ہو" عرض کیا جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں، فرمایا نہیں پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے" یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے اور اس حریف کو زیر کر سکے جس کا اکھاڑہ خود اس کے سینہ میں ہے،

۲- جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے، دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے، اس کا دور کرنا ہر حق طلب کے لئے ضروری ہے، ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو منور بنائے، تلوار سے قلب میں وہ روحانیت نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینہ میں پیدا ہوتی ہے، اسی لئے ارشاد ہوا کہ

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے رستہ کی
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم	طرف لانے کو حکمت و دانائی کی باتوں اور
بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، (نحل-۱۶)	اچھی نصیحت سے اور اچھی طرح بحث کر کے سمجھا

۱ ترمذی و کنز العمال کتاب الجہاد جلد ۲ ص ۲۰۵ ۲ صحیح مسلم باب من یملک نفسه عند الغضب جلد ۲ ص ۳۲۵

دین کی تبلیغ و دعوت جو سراسر علمی طریق سے ہے جہاد کی ایک قسم ہے اور اسی طریقہ کو

جہاد بالقرآن ہے، کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل، اپنی آپ موعظت اور اپنے لئے آپ مناظرہ

ہے، قرآن کا ایک ایک [illegible] قرآن کی صداقت و سچائی کے لئے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی

ضرورت نہیں [illegible] لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ کے دور [illegible] یعنی روحانی بیماریوں کی فوج

کو شکست دینے کے لئے اسی قرآن کی تلوار ہاتھ میں دی گئی، اور اسی سے کفار و منافقین کے

شکوک و شبہات کے پردوں کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا، ارشاد ہوا،

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ	تو کافروں کا کہنا نہ مان، اور بذریعہ
بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (فرقان ۵)	قرآن کے تو ان سے بڑی زور کا جہاد

بذریعہ قرآن کے جہاد کر یعنی قرآن کے ذریعہ سے ان کا مقابلہ کر، اس قرآنی جہاد و دعوت

کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر، بڑا جہاد اور بڑے زور کا مقابلہ فرمایا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ

اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن کی نظر میں کتنی ہے، علماء نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا اور

اس کو جہاد کا اہم بالشان درجہ قرار دیا ہے، امام ابوبکر رازی حنفی نے احکام القرآن میں اس

تفصیل بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے

بڑھ کر ہے، ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لئے اپنی فہم و علم

بصیرت تمام کرے اور اس کو اس راہ میں صرف کرے اور جو علوم اس راہ میں کام آسکتے ہوں

ان کو اس سے حاصل کرے، کہ اس سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائیگا۔

لہ احکام القرآن رازی قسطنطنیہ جلد ۳ ص ۱۱۵

علم کا جہاد ہے جو اہلِ علم پر فرض ہے،

۳۔ جہاد بالمال،

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا منشا بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے یہاں تک کہ اس کو اپنے اہل و عیال کی آرام و آسائش کے لئے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کے لئے دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے، چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپیے پر موقوف ہیں۔ اس لئے جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے، دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریک اور جد وجہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے، اس سرمایہ کا فراہم کرنا، اور اس کے لئے مسلمانوں کا ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و صحبت کی برکت سے صحابۂ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سے سخت گھڑیوں میں جس طرح مالی جہاد کیا ہے، وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہیں، اور انہی سیرابیوں سے دین کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھوں سرسبز و شاداب ہوا، اور اسی لئے اسلام میں ان بزرگوں کا بہت بڑا رتبہ ہے،

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا	بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی
وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ	اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ، (انفال-۱۰)	میں جہاد کیا۔

قرآن پاک میں مالی جہاد کی تنبیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیتیں ہیں [illegible]

ختم ہوگا جہاں تک جہاد یا مال کا ذکر نہ ہو، اور قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا ہے، جیسے

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا	ہلکے یا بھاری ہو کر جس طرح ہو، نکلو،
بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِیْ سَبِیْلِ	اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا
اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ	کے راستہ میں جہاد کرو، یہ تمہارے لئے
تَعْلَمُوْنَ. (توبہ - ۲)	بہتر ہے، اگر تم کو معلوم ہو،
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	مومن وہی ہیں، جو اللہ اور رسول پر
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا	ایمان لائے، پھر اس میں شک نہیں کیا،
وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ	اور اپنے مال، اور اپنی جان سے
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ	خدا کے راستہ میں جہاد کیا، یہی سچے
الصّٰدِقُوْنَ (حجرات - ۲)	اترنے والے ہیں،
فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ	اپنے مال اور اپنے نفس سے جہاد
وَاَنْفُسِهِمْ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَةً	کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں
(نساء - ۱۳)	پر ایک درجہ کی فضیلت دی ہے،

اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں،

میدانِ جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لئے ممکن نہیں، بلکہ مالی شرکت ہر ایک کے لئے آسان ہے،

جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت نہیں پیش آتی ہے لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے۔

انسان کی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے

گر جان طلبی مضائقہ نیست　　　　گر زر طلبی سخن درین ست

اس لئے مال کو جان پر مقدم رکھ کر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہوشیار کیا گیا ہے۔

۴۔ جہاد کے ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادا میں اپنی جان و مال و دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے۔ عورتیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ! ہم کو غزوات کے جہاد میں شرکت کی اجازت دی جائے، ارشاد ہوا کہ تمہارا جہاد نیک حج ہے[۱]، کہ اس مقدس سفر کے لئے سفر کی تمام زحمتوں کو برداشت کرنا صنف نازک کا ایک جہاد ہی ہے۔ اسی طرح ایک صحابی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں کہ کسی لڑائی کے جہاد میں شرکت کریں، آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ تمہارے ماں باپ ہیں، عرض کی جی ہاں۔ فرمایا "ففیھما فجاھد" تو تم ان ہی کی خدمت میں رہ کر جہاد کرو[۲] یعنی ماں باپ کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے۔ اسی طرح خطرناک موقع پر حق کے اظہار سے باز نہ آنا بھی جہاد ہے۔ آپ نے فرمایا:

إنَّ مِنْ أعظمِ الجهادِ كلمةَ عدلٍ عِنْدَ سُلْطانٍ جائرٍ (ترمذی باب الفتن)　　　　ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے انصاف کی بات کہہ دینا ہے۔

۱؎ صحیح بخاری کتاب الجہاد و ابو داؤد و ترمذی کتاب الجہاد

د. اس سے ظاہر ہو کہ جہاد بالنفس یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کے ان تمام اقسام کو شامل ہے جن میں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو، اور اس کی آخری حد خطرے سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دینا ہے۔ نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آپڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تل جائیں تو ان کو راستے سے ہٹانا، اور اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبۂ کمال ہے۔ ایسے جان نثار اور جانبازوں کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا، وہ ہمیشہ کے لئے اس کو بخش دی جائے یعنی فانی حیات کے بدلے اس کو ابدی حیات عطا کر دی جائے۔ اسی لئے ارشاد ہوا،

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي	جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو
سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ ؕ بَلْ	مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو اس کا
أَحْيَاءٌ وَّلٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ. (بقرہ-۱۹)	احساس نہیں،

آل عمران میں ان جانبازوں کی قدر افزائی ان الفاظ میں کی گئی ہے،

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا	جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو
فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا ؕ بَلْ	مردہ گمان نہ کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں
أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ	اپنے پروردگار کے پاس ان کو روزی
فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِن	دی جا رہی ہے، خدا نے ان کو اپنی جو
فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ	مہربانی عطا کی ہے اس پر وہ خوش ہیں
لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ	اور جو آج تک ان سے آ ملے

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا	تو جنھوں نے میری خاطر گھر بار چھوڑا
مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي	اور اپنے گھروں سے نکالے گئے، اور ان کو
وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ	میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں، اور لڑے
سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ	اور مارے گئے، ہم اُن کے گناہ اُن سے مٹا
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا	دیں گے، اُن کو جنت میں داخل کریں گے
مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ	جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، خدا کی طرف سے
حُسْنُ الثَّوَابِ (آل عمران ۲۰)	اُن کو یہ بدلہ ملیگا، اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے

ان آیات کی تفسیر و تشریح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ احادیث میں مذکور ہے جن میں شہیدوں کی فضیلتیں، اور اُن کی اُخروی نعمتوں کی تفصیل نہایت مؤثر انداز میں ہے، اسی شہادت درجہ کے عقیدے نے مسلمانوں میں مشکلات کے مقابلہ اور دشمن سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کردی جس کی زندگی اور تازگی کا سماں آج تیرہ سو برس کے بعد بھی دیکھ رہا عالم ہے، یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانوں کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کر دیتا ہے اور اس حیاتِ جاوید کی تلاش میں ہر مسلمان بیتاب نظر آتا ہے، یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کی، اور فرمایا کہ مجھے آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں، اور دوبارہ مجھے زندگی ملے، اور پھر اس کو بھی قربان کر دوں، پھر تیسری زندگی ملے، اور اس کو بھی میں خدا کی راہ میں نثار کر دوں۔[1] ذرا ان فقروں کا اندازِ بیان دیکھو

۱؎ صحیح مسلم کتاب الجہاد۔

ڈال لیجئے، اُن میں یہ نہیں ہے کہ میں دوسرے کو مار ڈالوں، بلکہ یہ ہے کہ حق کے راستہ میں میں مارا جاؤں اور پھر زندگی ملے، پھر مارا جاؤں، پھر زندگی ملے، اور پھر مارا جاؤں،

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را — ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

دائمی جہاد | یہ تو وہ جہاد ہے، جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا، اور جس کو آتا بھی ہے تو عمر میں ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے، مگر حق کی راہ میں دائمی جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آسکتا ہے، اس لئے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہر متبع پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیردستوں کی امداد، سیہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ عدل، ردِّ ظلم اور احکامِ الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے، یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش و سکون ایک جہاد بن جائے، اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے، سورۂ آل عمران کی جس میں جہاد کے مسائل مذکور ہیں، آخری آیت ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا	اے ایمان والو! مشکلات میں ثابت
وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا	قدم رہو، اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ
اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ.	اور کام میں لگے رہو، اور خدا سے ڈرو،
(آل عمران - ۲۰۰)	شاید کہ تم مراد کو پہنچو،

یہی وہ جہادِ محمدی ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح و فیروزی کا نشان ہے،

عباداتِ قلبی

اسلام کے اُن عبادات کا بیان تھا، جو جسمانی و مالی کہلاتی ہیں، گو کہ ان سے اخلاق کا شمول ان میں بھی ہے، لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادت بھی ہیں جن کا تعلق تمام تر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے، پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں ہر نیکی کا کام جو خدا کی رضا کے لئے ہو، عبادت ہے، اس لئے تمام امورِ خیر خواہ وہ جسمانی یا مالی یا قلبی ہوں، عبادت کے اندر داخل ہیں، فقہا نے صرف جسمانی و مالی عبادات سے بحث کی ہے، لیکن حضراتِ صوفیہ نے جسمانی و مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے، اصل یہ ہے کہ فقہا نے اپنا فرضِ منصب صرف جسمانی اور مالی فرضوں تک محدود رکھا ہے، اور صوفیہ نے اُن سارے فرائض کو بھی لیا ہے جن سے مقصود انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے، پیشِ نظر تصنیف نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہے اور نہ تصوف کی، اس کا مقصد ان فرائض کا بتانا ہے جن کی تاکید و توصیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے، اور اسی تاکید و توصیف سے ہم کو اسلام میں اُن کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس قسم کے چند فرائض جن کا مرتبہ عباداتِ پنجگانہ کے بعد قرآن پاک میں سب سے زیادہ

ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں، اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر شخص کے قلب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے، قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی آیت میں بیان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو تقویٰ رکھتے ہیں،

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (بقرہ-۱)
یہ تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے،

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشا اسی تقویٰ کا حصول ہے،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ-۳)
اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا، عبادت کرو، تاکہ تقویٰ پاؤ،

روزے سے بھی یہی مقصد ہے،

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ-۲۳)
تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو،

حج کا منشا بھی یہی ہے،

وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ (حج-۴)
اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان و مقامات) کی عزت کرتا ہے، تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے،

قربانی اسی غرض سے ہے،

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا
دِمَاؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی
مِنْکُمْ، (حج - ۵)

خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون
نہیں پہنچتا لیکن تمہارا تقوی اس کو
پہونچتا ہے،

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لیے جھکتی ہے، اس کی بنیاد بھی تقوی پر ہونی چاہیے

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَہٗ عَلٰی
تَقْوٰی مِنَ اللّٰہِ (توبہ ۱۳)

جس نے اپنی عمارت خدا سے تقوی
پر کھڑی کی،

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی
(توبہ - ۱۳)

البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقوی پر
قائم کی گئی،

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ میں راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے
زیادہ تقوی ہے،

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ
التَّقْوٰی، (بقرہ - ۲۵)

اور سفر میں زاد راہ لے کر چلو، اور
سب سے اچھی زاد راہ تقوی ہے،

ہمارے زیب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھ کر تقوی کا لباس ہے

وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ
(اعراف ۳)

اور تقوی کا لباس، وہ سب سے
اچھا ہے،

اسلام کی تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقوی کی بنیاد پر ہے،

وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (بقرہ ۳۱)

اور معاف کر دینا تقوی کے قریب تر ہے

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ-۲) | انصاف کرو، تقویٰ سے قریب تر ہے

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (آل عمران-۱۹) | اور اگر صبر کرو، اور تقویٰ کرو، تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے،

وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ (بقرہ-۲۸) | اور تقویٰ کرو، اور لوگوں کے درمیان صلح کراوؤ،

وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (نساء-۱۹) | اور اگر اچھے کام کرو، اور تقویٰ کرو، تو اللہ تمہارے کاموں کی خبر دار ہے،

اہل تقویٰ ہر قسم کی اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں | آخرت کی ہر قسم کی نعمتیں انہی تقویٰ والوں کا حصہ ہیں

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ، (دخان-۳) | بے شبہ تقویٰ والے امن و امان کی جگہ میں ہوں گے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ (طور-۱) | بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور نعمت میں ہوں گے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ (ذاریات-۱) | شک نہیں کہ تقویٰ والے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ (قمر-۱) | بے شبہ تقویٰ والے باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّ | بے شبہ تقویٰ والے سایوں میں

وَّعُیُوْنٍ (مرسلٰت ۱۰)	اور چشموں میں ہوں گے،
اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّہِمْ جَنّٰتِ	بیشک تقویٰ والوں کے لئے ان کے
النَّعِیْمِ (ن ۲)	پروردگار کے پاس نعمت کے باغ ہیں،
اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا (نبأ ۲)	بے شبہ تقویٰ والوں کے لئے کامیابی ہے
اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ (ص ۴)	اور بے تقویٰ والوں کے لئے بازگشت کی اچھائی ہے،

کامیابی اہل تقویٰ کے لئے ہے گو بظاہر ابتدا میں اہل تقویٰ کو کسی قدر مصیبتیں اور بہت پیش
آتیں یا بہت سی حرام اور مشتبہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑتا ہے اور ہر قسم
کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششوں اور ناروا راستوں سے پرہیز کرنا پڑتا ہے، اور اس سے یہ نتیجہ
کہ ان کو مال و دولت، عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی رہی، لیکن دنیا کے تنگ نظر
فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دنیا کے فوری
ثمروں کی بنا پر کام کے اچھے برے نتیجوں کا فیصلہ کرلینا چاہئے، حالانکہ جو جتنا دور بین ہو اسی
قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے، حقیقی دوربین اور دور
اندیش وہ ہیں، جو کام کی اچھائی برائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چند روزہ اور فوری
فائدہ کے لحاظ سے نہیں، بلکہ آخرت کے دائمی اور دیرپا فائدہ کی بنا پر کرتے ہیں، اور جب
نظر آخرت کے ثمروں پر رہتی ہے، تو دنیا بھی ان کی بنجاتی ہے، اور یہاں اور وہاں دونوں
کامیابی اور فوز و فلاح ان ہی کی قسمت میں ہوتی ہے۔ فرمایا،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ اور جان لو کہ بیشک اللہ تقویٰ والوں
(بقرہ ۲-۲۴) کے ساتھ ہے،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ اور یقین رکھو کہ اللہ تقویٰ والوں
(توبہ ۱۲۰-۵) کے ساتھ ہے،

قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے، ایک کام ہزاروں اغراض اور سیکڑوں مقاصد کو سامنے رکھکر کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان میں اللہ تعالیٰ صرف اُن ہی کے کاموں کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے، جو تقویٰ کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں، فرمایا،

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول
(مائدہ-۵) فرماتا ہے،

اسی لئے اُن ہی کے کاموں کو دنیا میں بھی بقا، قیام اور ہر دلعزیزی نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی،

تقویٰ والے کون ہیں یہ جان لینے کے بعد کہ اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت اور وہی سارے اسلامی تعلیمات کی روح ہے، اور دین و دنیا کی تمام نعمتیں اہل تقویٰ ہی کے لئے ہیں یہ بتانا کہ تقویٰ والے کون ہیں، قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دیدیا ہے چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے جو سورۂ زمر میں ہے،

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ اور جو سچائی لے کر آیا اور اس کو سچ
وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ مانا، وہی لوگ ہیں تقویٰ والے کہلانے کے مستحق ہیں

يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ (زمر)	ان کے رب کے پاس وہی جو وہ چاہیں یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا۔

یعنی تقویٰ وہ ارادہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور کام کے ہر پہلو میں سچائی کے کرنے اور ہر بدی سچائی کو سچ جانے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں، بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے، اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راستبازی کے جادہ سے بال برابر ہٹنا نہیں چاہتا لیکن اس تقویٰ کا پورا نقشہ سورۂ بقرہ آیت میں ہے

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ	لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر، اور پچھلے دن
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ	پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں
وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ	پر ایمان لایا، اور اپنا مال اس کی محبت پر
ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ	رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ	اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کے
فِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ	آزاد کرانے میں دیا، اور نماز کو برپا کیا
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ	اور زکوٰۃ ادا کی، اور جو عہد کر کے اس
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا	عہد کو ایفا کرنے والے ہیں، اور سختی،
وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ	تکلیف اور لڑائی میں صبر کرنے والے
وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ	ہیں یہی وہ ہیں جو سچے ٹھہرے، اور یہی

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ
الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ
فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ
وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ
كَلِمَةَ التَّقْوَى وَكَانُوا أَحَقَّ
بِهَا وَأَهْلَهَا. (فتح - ۳)

اور جب کفار نے اپنے دلوں میں
پچ رکھی، نادانی کی پچ، تو اللہ
نے اپنا چین اپنے رسول پر اور مسلمانوں
پر اتارا، اور اُن کو تقویٰ کی بات
لگا رکھا، اور وہی تھے اس کے لائق
اور اس کے اہل،

یہاں جنگ و خونریزی سے احتراز، خانہ کعبہ کے ادب اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبیت سے چشم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اور دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایفائے عہد اور حتی الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والوں کو متقی یعنی تقویٰ والے فرمایا ہے اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے،

فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَى
مُدَّتِهِمْ، إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ
الْمُتَّقِينَ، (توبہ - ۱)

تو تم اُن کے عہد کو اُن کی مقررہ
مدّت تک پورا کرو، خدا تقویٰ والوں
کو پیار کرتا ہے،

فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا
لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ
(توبہ - ۲)

تو وہ جب تک تم سے سیدھے رہیں
تم بھی اُن کے ساتھ سیدھے رہو خدا
تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے.

جس طرح انسان کا فجور، بری تعلیم، بری صحبت، اور برے ماحول کی مشق اور کثرت

بڑھتا جاتا ہے، اس طرح اچھے کاموں کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے، اور اس کی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے،

وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ	جو لوگ راہ پر آئے، خدا نے ان کی سوجھ اور بڑھائی، اور ان کو ان کا تقویٰ عنایت کیا،

اس سے عیاں ہے کہ "تقویٰ" ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے، جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے، اور جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہدایت پر ہدایت، اور فطری تقویٰ پر مزید دولتِ تقویٰ مرحمت ہوتی ہے،

تقویٰ کی یہ حقیقت، کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے، ایک صحیح حدیث سے تصریحاً معلوم ہوتی ہے، صحابہ کے مجمع میں ارشاد فرمایا،

اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا. (مسلم)	تقویٰ یہاں ہے،

اور یہ کہکر دل کی طرف اشارہ فرمایا، جس سے بے شک وشبہہ یہ واضح ہوجاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور عالی ترین کیفیت کا نام ہے، جو تمام نیکیوں کی محرک ہے، اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے، اور یہی سبب ہے کہ وہ قرآن پاک کی رہنمائی کی غایت، ساری ربانی عبادتوں کا مقصد اور تمام اخلاقی تعلیموں کا ماحصل قرار پایا،

اسلام میں برتری کا معیار اسلام میں تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیم محمدی نے رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب، نسب، غرض نوعِ انسانی کے ان سب خود ساختہ

ازی مرتبوں کو مٹا کر صرف ایک ہی امتیازی معیار قائم کر دیا جس کا نام تقویٰ ہو، جو ساری نیکیوں کی جان ہے اور اس لئے وہی معیاری امتیاز بن سکے۔ چنانچہ قرآن پاک نے بآواز بلند یہ اعلان کیا۔

جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ	ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے
لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ	صرف اس لئے بنایا کہ باہم شناخت
اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ	ہو سکے، تم میں سے خدا کے نزدیک
	معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ
(الحجرات - ۲)	تقویٰ دار ہے

اس اعلان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا، الکرم التقویٰ یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے، اور اسی کو حجۃ الوداع کے خطبہ میں پکار کر فرمایا کہ عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں، برتری اس کو ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ دار ہے۔

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد ہو اور اسی نیت ہی اس کے مذہب
کی ہر عبادت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام کیا جائے اس
کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو، ورنہ اس سے مقصود ریا و نمائش، طلب منفعت، طلب
شہرت یا طلب معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو۔
اسی کا نام اخلاص ہے۔ رسولؐ کو حکم ہوتا ہے۔

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ — تو اللہ کی عبادت اخلاص سے کرتے ہو
الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ — اطاعت گذاری کو اسی کے لئے ہمیشہ
الْخَالِصُ ۝ (زمر-۱) — اللہ ہی کیلئے ہے خالص اطاعت گذاری

مقصود یہ ہے کہ خدا کی اطاعت گذاری میں خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ
بنایا جائے، وہ چیز خواہ پتھر یا مٹی کی مورت، یا آسمان و زمین کی کوئی مخلوق، یا مال و دولت
ہو کوئی باطل مقصود ہو۔ اسی لئے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی اغراض و خواہشات
کو بت پرستی قرار دیا ہے۔ فرمایا۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ — کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی
هَوٰىهُ ۝ (فرقان-۴) — خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے

چنانچہ اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری و باطنی
بت پرستی سے پاک ہو، رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے

قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ — کہہ دے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں

مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ۝ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ (زمر-۲)	اطاعت گذاری کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس کی عبادت کروں، اور مجھے حکم دیا گیا ہے، کہ میں پہلا فرمانبردار ہوں، کہدے کہ میں ڈرتا ہوں کہ اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، بڑے دن کے عذاب سے کہدے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں اپنی اطاعت گذاری کو اس کے لئے خالص کر کے تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر جس کی عبادت چاہے کرو،

قرآن پاک کے سات موقعوں پر یہ آیت ہے:

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ،	اطاعت گذاری کو خدا کے لئے خالص کر کے،

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لئے ہو یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بت پرستی اور خواہش نفسانی کو دخل نہ ہو، اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ (لیل-۱) یعنی خدائے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو، انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس سے ہم کو کوئی دنیاوی مزد و رزق یا معاوضہ مطلوب نہیں،

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ — میری مزدوری تو اسی

(شعراء ۶-۷-۸-۹-۱۰) — پر ہے جو ساری دنیا کا پروردگار ہے

حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے یوں فرمایا گیا،

يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا — اے میری قوم! میں تم سے اس پہ

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ — دولت کا خواہاں نہیں، میری مزدوری

(ھود - ۳) — تو خدا ہی پر ہے

خود ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ کہہ دینے کا فرمان ہوا کہ تم سے اپنے لئے
کوئی مزدور اجرت نہیں چاہتا اگر چاہتا بھی ہوں تو تمہارے ہی لئے،

قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ — کہدے کہ میں نے تم سے جو اجرت

لَكُمْ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ — چاہی تو وہ تمہارے ہی لئے، میری

وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ — اجرت تو اللہ پر ہے اور وہ ہر بات

(سباء-۶) — پر گواہ ہے،

یعنی وہ ہر بات کا حال اور نیتوں سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش
بے غرض اور صرف خدا کے لئے ہے دوسری جگہ فرمایا،

لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا — میں تم پر تم سے کوئی مزدوری نہیں

الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ (شوریٰ-۳) — چاہتا، مگر قرابت داروں میں محبت کرنا

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششوں سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے

اس کے لئے وہ تم سے کسی ذاتی منفعت کا خواہاں نہیں، اگر وہ اس کے معاوضہ میں کچھ چاہتا ہے تو یہ کہ قرابت داروں کا حق ادا کرو، اور آپس میں محبت رکھو

اسی قسم کی بات ایک دوسری آیت میں ظاہر کی گئی ہے

قُلْ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا

(فرقان-۵۰)

کہہ دے کہ میں تم سے اس رہنمائی پر مزد کوئی معاوضہ نہیں مانگتا بجز اس کے کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ پکڑے،

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ حق کو قبول کر لیں،

دنیا میں بھی خواص و عوام کا [illegible] ہے، کوئی بندہ نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے، لیکن اس کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض یا شخصی دکھاوا اور نمائش تھا تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً نگاہوں سے گر جائے گی، اسی طرح روحانی مذہب کی خدا کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قدر نہیں، جو اس کی بارگاہ بے نیاز کے سوا کسی اور کے لئے پیش کی گئی ہو، مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور با خیالِ مزد و اجرت و تحسین و شہرت کی طلب سے پاک ہو، یہ تحسین و شہرت کا معاوضہ کی دین تو الگ رہا دنیا بھی انہی کو دیا کرتی ہے جن کی نسبت اس کو یقین ہو کہ انہوں نے اپنا کام ان ہی اغراض کے ساتھ انجام دیا ہے،

ہم جو کام بھی کرتے ہیں اس کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک مادی جو ہمیشہ ظاہری

جسمانی اعضا کی حرکت و جنبش سے پیدا ہوتی ہے، دوسری روحانی جس کا ہیولیٰ اور حقیقت
ارادہ و نیت، اور کام کی اندرونی غرض و غایت سے تیار ہوتا ہے، اسی کی بنا پر برکت دین
اور دنیا دونوں میں اسی روحانی پیکر کے حسن و قبح، اور ضعف و قوت کی بنا پر ہوتی ہے۔ انسانی
اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہے، اسی لیے اس اخلاص کے بغیر اسلام میں
نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے، اور نہ اخلاق و معاملات عبادت کا درجہ پاتے ہیں، اس لیے
ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر مخلص غرض و نیت
یا مال اور ہر دنیاوی فائدہ و اجرت سے پاک رکھیں، تورات اور قرآن دونوں میں آدم کے
آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ہے، دونوں نے خدا کے حضور میں اپنی اپنی پیداوار کی قربانیاں پیش کیں
خدا نے ان میں سے صرف ایک کی قربانی قبول کی، اور اس کی زبان سے اپنا یہ بدیع اصول ظاہر فرما دیا

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (مائدہ-۵) خدا تو متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔

متقی بھی وہی ہوتے ہیں، جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لیے کام
کرتے ہیں، ان ہی کا کام قبول ہوتا ہے، اور ان کو دین و دنیا میں فوز و فلاح بخشتا ہے، ان کو
خدا کے یہاں محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے، اور دنیا میں ان کو سرداری و عزت بخشی جاتی ہے، ان کے کاموں
کو شہرت نصیب ہوتی ہے، اور ان کے کارناموں کو زندگی بخشی جاتی ہے، وہ جماعتوں اور
قوموں کے محسن ہوتے ہیں، لوگ ان کے ان کاموں سے نسلاً بعد نسلٍ فیضیاب ہوتے ہیں، اور
ان کے لیے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں، حضرت موسیٰ کے عہد میں فرعونیوں کو پیغمبر اور جادوگروں
کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، کہ ان دونوں سے انھوں نے عجائب دیکھے تھے، تو

کا یکساں مشاہدہ کیا۔ خدا نے فرمایا: ان دونوں کے بیچ ترتیب میں ظاہری نہیں، باطنی صورت کا فرق ہے، ایک کام کی غرض محض تماشا اور بازی گری ہے، اور دوسرے کا نتیجہ ایک نئی قوم کی خوشی اور روحانی زندگی کا انقلاب ہے۔ اسی لئے یہ فیصلہ ہے کہ

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ۔ اور جادوگر جدھر سے بھی آئے فلاح نہیں پائے گا۔ (طٰہٰ - ۳)

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا، کہ مصر کے جادوگروں کے حیرت انگیز کرتب صرف کہانی بن کر رہ گئے اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات نے ایک نئی قوم، ایک نئی شریعت، ایک نئی زندگی، ایک نئی سلطنت پیدا کی، جو مدتوں تک دنیا میں قائم رہی۔

غرض عمل کی اصلی پیداوار وہی ہے، جو دل کے کارخانہ میں تیار ہوتا ہے، اسی لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے۔ اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہوتا جائے گا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لئے ارادہ و نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے۔

توکل

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آلِ عمران)

توکل قرآن کی ایک اصطلاح کا اہم لفظ ہے، بعض لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لئے جدوجہد اور کوشش نہ کی جائے، بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑ کے کسی حجرہ یا خانقاہ میں بیٹھ رہا جائے، اور یہ سمجھ لیا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے، وہ قسمت یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے، وہ ہو رہے گا، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں، لیکن یہ مرحلہ وہم ہی وہم ہے، یا ہیچوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے جس کو اسلام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔

توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں، اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ رکھنے کو کہتے ہیں، لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا؟ کسی کام کے کرنے میں، یا نہ کرنے میں؟ جاہل صوفیوں نے ترکِ عمل، اسباب و تدابیر سے بے پروائی اور خود ہاتھ پاؤں نہ ہلا کر دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھ دیا ہے، حالانکہ توکل، صرف کسی کام کو پورے عزم و ارادہ اور پوری کوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا ہے کہ اگر اس کام میں بھلائی ہو تو خدا اس [illegible]

ہم کو کامیاب فرمائے گا،

اگر تدبیر اور جد وجہد و کوشش کا ترک ہی توکل ہوتا، تو دنیا میں لوگوں کے سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو مبعوث نہ کرتا، اور ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لئے جد وجہد اور سعی و سرگرمی کی تاکید نہ فرماتا، اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا، نہ بدر و احد اور خندق و حنین میں سواروں، تیر اندازوں، زرہ پوشوں اور تیغ آزماؤں کی ضرورت پڑتی، اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی،

توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے، حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے تو سب سے پہلے اس کے متعلق دوسروں سے مشورہ لے لو، مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے، تو اس کے انجام دینے کا عزم کرلو، اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کر دو، اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب دلخواہ نتیجہ پیدا کرے گا، اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت و مصلحت و مشیت سمجھو، اور اس سے مایوس اور بودے نہ بنو، اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے، تو یہ غرور نہ کرو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جد وجہد کا نتیجہ اور اثر ہے، بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم ہوا، اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا، آل عمران میں ہے،

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا	اور کام (یا لڑائی) میں ان سے مشورہ
عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ	لے لو، پھر جب پکا ارادہ کرلو تو اللہ
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ	پر بھروسہ رکھو بے شک اللہ (اللہ)

بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ
لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا
الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

(آل عمران - ۱۶۰)

اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم
پر غالب نہ آ سکے گا، اور اگر وہ تم کو
چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے
بعد تمہاری مدد کر سکے، اور اللہ ہی
پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ رکھیں۔

ان آیات نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کر دی کہ توکل بے دست و پائی اور ترکِ عمل کا نہیں بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم و ارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اس کا نتیجہ خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے، اور یہ سمجھا جائے کہ خدا مددگار ہو تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کر سکتا، اور اگر وہی نہ چاہے، تو کسی کی کوشش اور مددگار نہیں ہو سکتی، اس لئے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام میں خدا پر بھروسہ رکھے۔

منافق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور راتوں کو جوڑ توڑ کرتے ہیں، تو حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالوں کی پروا نہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو، وہی تمہارے کاموں کو بنانے والا ہے۔

فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى
اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا

(نساء - ۸۱)

تو ان منافقوں سے درگزر کر اور خدا
پر بھروسہ رکھ، اور اللہ بس کام
بنانے والا ہے۔

آغازِ اسلام میں تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی علانیہ دعوت

کا حکم ہوتا ہے۔ منافقوں کی کثرت اور دشمنوں کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دی جاتی ہے، اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پروا کئے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کرکے کام شروع کردو،

وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ
مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۚ فَإِنْ عَصَوْكَ
فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ
وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ
الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ
وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ.

(شعراء - ۱۱)

اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا
کر، اور مومنوں میں سے جو تیری پیروی
کرے اس کے لیے اپنی (شفقت) کا باز
بازو جھکا، پھر اگر وہ تیرا کہا نہ مانیں تو
کہدے کہ میں تمھارے کاموں سے
الگ ہوں، اور اُس غالب رحمت والے
پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو دیکھتا ہے جب
تو رات کو اٹھتا ہے، اور نمازیوں
میں تیری آمد و رفت کو ملاحظہ کرتا ہے،

دشمنوں کے نرغے میں ہونے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تنہائی میں راتوں کو اٹھ کر عبادت گذار مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے، یہ جرأت اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ تھی، مشکلات میں اسی توکل اور اللہ پر اعتماد کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے۔ احزاب میں منافقوں اور کافروں کی مخالفانہ کوششوں سے بے پروا ہوکر اپنے کام میں لگے رہنے کا جہاں حکم دیا گیا ہے وہاں اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے،

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ	اے پیغمبر خدا سے ڈر، اور کافروں و
الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ	منافقوں کا کہنا مان، بے شک اللہ
كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى	جاننے والا اور حکمت والا ہے، اور جو
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ	تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف
كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ وَّ	سے وحی کی جاتی ہے، اس کے پیچھے چل،
تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ	بیشک خدا تمہارے کاموں سے خبردار
وَكِيْلًا ۝	ہے، اور اللہ پر بھروسہ رکھ، اور اللہ
(احزاب ۱)	کام بنانے کو کافی ہے،

کفار سے مسلسل لڑائیوں کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر یہ لوگ صلح کی طرف جھکیں، تو تم بھی جھک جاؤ، اور مصالحت کر لو، اور یہ خیال نہ کرو، کہ یہ دھوکا نہ دیں، خدا پر بھروسہ رکھو، تو اُن کے فریب کا داؤ کامیاب نہ ہوگا،

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا	اور اگر وہ صلح کے لئے جھکیں، تو تو بھی
وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ	جھک جا، اور خدا پر بھروسہ رکھ، بیشک
الْعَلِيْمُ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ	وہ سننے والا، اور جاننے والا ہے، اور
فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْۤ	اگر وہ تجھ کو دھوکا دینا چاہیں تو کچھ
اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝	پروا نہیں کہ تجھے اللہ کافی ہے، جس نے
(انفال ۸)	تجھ کو اپنی اور مسلمانوں کی نصرت سے

سنہ ۲ ہجری

یہودیوں کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر ناز تھا، اُن سے بھی بے خوف و خطر ہو کر اللہ
کے بھروسہ پر مسلمانوں کو حق کی تائید کے لئے کھڑے ہو جانے کا حکم ہوتا ہے

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ
بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي
هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ وَإِنَّهُ
لَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ
إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ
بِحُكْمِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّكَ عَلَى
الْحَقِّ الْمُبِينِ. (نمل - ٦)

بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر
وہ باتیں ظاہر کر دیتا ہے جن میں وہ
مختلف ہیں، اور بیشک یہ قرآن مسلمانوں
کے لئے ہدایت اور رحمت ہے، بیشک
تیرا پروردگار اُن کے درمیان اپنے حکم
سے فیصلہ کر دے گا، اور وہی غالب
اور جاننے والا ہے تو تو خدا پر بھروسہ
رکھ، بیشک تو کھلے حق پر ہے۔

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی مشکلوں میں بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی
ہدایت ہے کہ وہ کسی دولت کی یا زر و مال نہیں، وہ ایسی ہستی ہے جس کو فنا نہیں، فرمایا،

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَ
نَذِيرًا. قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ
مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ
يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا.
وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي

اور میں نے تو (اے رسول) تجھے خوشخبری
سنانے والا، اور ہشیار کرنے والا بنا کر
بھیجا ہے، کہدے کہ میں تم سے اس کے
سوا (اپنے کام کی) کوئی مزدوری نہیں
مانگتا کہ جو چاہے اپنے پروردگار کا رستہ

لَایَمُوْتُ، — قبول کرے، اور اس زندہ رہنے والے پر

(فرقان - ۵) — بھروسہ کر جس کو موت نہیں.

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کیے جاؤ، مخالفین کی پروا نہ کرو، وہ خدا پر بھروسہ رکھو جس کے سوا کوئی دوسرا با اختیار نہیں،

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ — تو گر یہ مخالفین کہا نہ مانیں تو تم

لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ — کہدو کہ مجھے اللہ بس ہے نہیں کوئی معبود

وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ، — لیکن وہی اسی پر میں نے بھروسہ کیا،

(توبہ ۱۲۰) — وہ بڑے تخت کا مالک ہے،

آپس کے اختلافات میں اللہ کا فیصلہ چاہیئے، اس حالت میں بھی اسی پر بھروسہ چاہیئے

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْہِ مِنْ شَیْءٍ — اور جس چیز میں تم میں رائے کا اختلاف ہے

فَحُکْمُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ — تو اس کا فیصلہ خدا کی طرف ہے، وہی

رَبِّیْ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ — اللہ ہے میرا پروردگار، اسی پر میں

اُنِیْبُ، — بھروسہ کرتا ہوں، اور اسی کی طرف

(شوریٰ - ۲) — رجوع کرتا ہوں،

رسول کو خدا کی آیتیں پڑھ کر نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے، اور تسلی دی جاتی کہ ان کے کفر و نافرمانی کی پروا نہ کرو، اور اپنی کامیابی کے لیے خدا پر بھروسہ رکھو،

کَذٰلِکَ اَرْسَلْنٰکَ فِیْٓ اُمَّۃٍ — ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم میں بھیجا

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ
لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ
اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ
قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ
(الرعد - ۴)

جس سے پہلے بہت سی قومیں گذر چکیں
تاکہ تو اُن کو وہ پیام سنائے جو ہم نے
تجھ پر وحی کیا ہے، اور وہ رحمان کے
ماننے سے انکار کرتے ہیں، کہدے کہ وہ
میرا پروردگار ہے کوئی معبود نہیں،
لیکن وہی، میں نے اس پر بھروسہ
کیا، اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے، اور گمراہوں کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد ان کے شر اور ان سے پراگندہ خاطر نہ ہونا چاہئے، کفار کو یہ آیت سنا دینی چاہیے،

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُوْنَ
مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔
(الملک - ۲)

کہدے وہی ہے رحم والا ہم اُس پر
ایمان لائے، اور اسی پر بھروسہ کیا
تو تم جان لو گے، کہ کون کھلی گمراہی
میں ہے۔

جس طرح ہمارے رسول کو اور تمام مسلمانوں کو ہر قسم کی مصیبتوں، مخالفتوں اور مشکلوں میں خدا پر توکل اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار دی ہے، آپ سے پہلے پیغمبروں کو بھی اس قسم کے نازک موقعوں پر اسی کی تعلیم دی گئی ہے، اور خود اولوالعزم رسولوں کی زبانوں سے اس تعلیم

کا اعلان ہوتا رہا ہے، حضرت نوح علیہ السلام جب تن تنہا سالہا سال تک کافروں سے
پھنسے رہے، تو انھوں نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ اپنے دشمنوں کو یہ اعلان فرمایا،

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ	(اے پیغمبر) اُن کو نوح کا حال سُنا، جب
لِقَوْمِهِ يٰقَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ	اُس نے اپنی قوم سے کہا، اے میرے
عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيٰتِ	لوگو! اگر میرا رہنا، اور اللہ کی نشانیوں
اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا	کے ساتھ میرا نصیحت کرنا، تم پر شاق
أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ	گزرتا ہے، تو اللہ پر میں نے بھروسہ
أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا	کر لیا ہے، تم اپنی تدبیر کو اور اپنے
إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِ ۝	شریکوں کو خوب مضبوط کر لو، پھر تم
	پر تمھاری تدبیر چھپی نہ رہے، پھر اس کو
(یونس - ۸)	مجھ پر پورا کر لو، اور مجھے مہلت نہ دو

غور کیجئے کہ حضرت نوحؑ نے دشمنوں کے ہر قسم کے مکروفریب سازش اور لڑائی بھڑائی
کے مقابلہ میں استقلال اور عزیمت کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبرانہ شان سے
فرمایا ہے، حضرت ہود علیہ السلام کو اُن کی قوم جب اپنے دیوتاؤں کے قہر و غضب سے
ڈراتی ہے، تو وہ جواب میں فرماتے ہیں۔۔

إِنِّي أُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوا	میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی
أَنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ مِنْ	گواہ رہو کہ اُن سے بیزار ہوں جن کو

دُونِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ، اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ، (ھود - ۵)

تم خدا کے سوا شریک ٹھہراتے ہو، پھر تم سب مل کر میرے ساتھ داؤ کرلو پھر مجھے مہلت نہ دو، میں نے اللہ پر جو میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہی، بھروسہ کرلیا ہے،

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری مخالفتوں کی پرواہ نہیں ہے، جو اصلاح کا کام کرنا ہے، وہ کروں گا، میرا تکیہ خدا پر ہے،

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (ھود - ۸)

میں تو جب تک مجھ میں طاقت ہے، کام سدھارنا چاہتا ہوں، میری توفیق اللہ ہی سے ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں

ان پیغمبروں کی اس استقامت، صبر اور توکّل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ کو بھی اپنے کاموں کے مشکلات میں اسی طرح پر توکّل کرنا چاہیے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ وَانْتَظِرُوْا

کہہ دو ان سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ کام کرو ہم بھی کرتے ہیں اور تم بھی (نتیجہ کا) انتظار کرو،

إِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ وَلِلّٰهِ غَيْبُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ
يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ، فَاعْبُدْهُ
وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ.
(ھود - ۱۰)

ہم بھی کرتے ہیں، اور اللہ ہی کے قبضہ
میں ہے، آسمانوں کا اور زمین کا چھپا
بھید، اور اسی کی طرف سارے کاموں
کا فیصلہ لوٹایا جاتا ہے، پھر اس کی
عبادت کر، اور اس پر بھروسہ کر۔

مسلمانوں کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے پیروؤں کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز و قریب سب کو چھوڑ کر الگ ہو گئے اور خدا کی راہ میں کسی کی دوستی و محبت کی پروا نہ کی۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ
اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا
مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ
وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا
بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ
لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ

تمہارے لئے ابراہیم اور اُن کے ساتھیوں
میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے، جب
انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم
سے اور خدا کے سوا جن کو تم پوجتے ہو،
ان سے بیزار ہیں، ہم نے تمہارے مسلک
کا انکار کر دیا، اور ہم میں اور تم میں
دشمنی اور نفرت ہمیشہ کے لئے کھل
گئی، جب تک تم ایک خدا پر ایمان
نہ لاؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے

وَمَآ اَمۡلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ شَيۡءٍ ۚ رَبَّنَا عَلَيۡكَ تَوَكَّلۡنَا وَاِلَيۡكَ اَنَبۡنَا وَاِلَيۡكَ الۡمَصِيۡرُ ۔

(ممتحنہ - ۱)

یہ کہ میں تمہارے لئے خدا سے دعا کروں گا، اور مجھے خدا کے کام میں کوئی دخل نہیں، اے ہمارے پروردگار! تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا، اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کیا، اور تیرے ہی پاس لوٹ کر جانا ہے،

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے عزیز بیٹوں کو مصر بھیجتے ہیں، لیکن فرط محبت سے ڈرتے ہیں کہ یوسف کی طرح ان کو بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے، بیٹوں کو کہتے ہیں کہ تم سب شہر کے ایک دروازہ سے نہیں، بلکہ متفرق دروازوں سے اندر جانا، اس ظاہری تدبیر کے بعد ہی خیال آتا ہے کہ کارساز حقیقی تو خدا ہے، ان تدبیروں سے اس کا حکم ٹل نہیں سکتا ہے، اس لئے بھروسہ تدبیر پر نہیں بلکہ خدا کی کارسازی پر ہے۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدۡخُلُوۡا مِنۡ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادۡخُلُوۡا مِنۡ اَبۡوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغۡنِيۡ عَنۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ شَيۡءٍ ؕ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ ۚ وَعَلَيۡهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ

اور یعقوبؑ نے کہا، اے میرے بیٹو! ایک دروازہ سے نہ جانا، بلکہ الگ الگ دروازوں سے جانا، اور میں تم کو خدا سے ذرا بھی بچا نہیں سکتا، فیصلہ اللہ ہی کا ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا، اور اسی پر چاہئے کہ بھروسہ

اَلْمُتَوَكِّلُوْنَ، (یوسف ۱۰) — کرنے والے بھروسہ کریں،

حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ظاہری تدبیر شانِ ت[illegible]
کے منافی نہیں،

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں جب اُن کی قوم ان کو زبردستی
بت پرست بن جانے پر مجبور کرتی ہے، ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے تو
کے جواب میں وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہیں۔

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا
إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ
نَجَّانَا اللّٰهُ مِنْهَا وَمَا يَكُوْنُ لَنَا
أَنْ نَعُوْدَ فِيْهَا إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ
اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ
عِلْمًا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا
افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ
وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِيْنَ،
(اعراف ۱۱)

اگر ہم پھر تمہارے مذہب میں آ جائیں
جب ہم کو خدا اس سے بچا چکا تو ہم نے
خدا پر جھوٹ باندھا، اور یہ ہم سے
نہیں ہو سکتا کہ ہم پھر اس میں لوٹ کر
جائیں، مگر یہ کہ ہمارا پروردگار خدا
ہی چاہے، ہمارا پروردگار اپنے علم
سے ہر چیز کو سمائے ہے ہم نے خدا پر
بھروسہ کیا، اے ہمارے پروردگار
ہمارے اور ہماری قوم کے بیچ میں تو
حق کا فیصلہ کر دے، اور تو ہی سب
فیصلہ کرنے والوں میں سے بہتر فیصلہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دل بادل لشکر اور شاہانہ زور و قوت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو خدا ہی پر توکل کی تعلیم دی فرمایا

یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ	اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان
فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ	رکھتے ہو، تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر
مُّسْلِمِيْنَ. (یونس - ۹)	تم فرمانبردار ہو۔

ان کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کے ساتھ جواب دیا،

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا	ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا، ہمارے
تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ،	پروردگار ہم کو ظالم قوم کے لئے
(یونس - ۹)	آزمائش نہ بنا،

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا، اور ان کو اپنی خاص نوازشوں سے جس طرح سرفراز کیا، اس سے ہر شخص واقف ہے، یہ سب کچھ ان کے اسی توکل کے صدقہ میں ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرمادیا ہے،

مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ	جو خدا پر بھروسہ کرے گا تو وہ
حَسْبُهٗ، (طلاق - ۱)	اس کو کافی ہے،

یہ آیت پاک خانگی و معاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے کہ اگر میاں بیوی میں نباہ کسی طرح نہ ہو سکے اور دونوں میں قطعی علحدگی (طلاق) ہوجائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا

نہ چاہیے کہ ہمارا سامان کیا ہوگا، اور ہم کہاں سے کھائیں گے ؛

ع خدا خود میرِ سامان است اربابِ توکل را

توکل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں، وہ ایک ایک کرکے آپ کے سامنے ہیں، ہر ایک پر غور کی نظر ڈالیے کہ اُن میں سے کوئی بھی ان معنوں میں ہے جن میں ہم اپنی بے ہمتی سے اس کو سمجھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے ہجوم، موانع کی کثرت اور پُر زور مخالفوں کی تدبیروں سے نڈر ہو کر استحکام، عزم، اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہیں، کہ خدا کی مدد سے کام کے حسبِ خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل میں یقین رکھیں،

احادیث میں ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ! میں اونٹ کو یونہی چھوڑ کر خدا پر توکل کروں (کہ میرا اونٹ مجھ کو مل جائے گا)، یا اس کو باندھ کر؟ ارشاد ہوا اس کو باندھ کر خدا پر توکل کر[1]

اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع میں ادا کیا ہے

ع برتوکل زانوے اشتر بہ بند

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں، تاہم حقیقت کے رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین منشا کے مطابق ہے،

---

[1] یہ حدیث بلفظ اعقلها وتوکل ترمذی (آخر ابواب صفة القیامة) ص ۴۰۴، وقیدها وتوکل شعب الایمان بیہقی میں، قیدها وتوکل خطیب کی روۃ مالک اور ابن عساکر میں ہے، (کنز العمال جلد ۲ ص ۲۰۲ حیدرآباد دکن)

بعض لوگ تعویذ گنڈا، غیر شرعی جھاڑ پھونک، ٹوٹکے، اور منتر پر یقین رکھتے ہیں اور
سمجھتے ہیں کہ ان اسباب و تدابیر کو چھوڑ کر ان چیزوں سے مطلب برآری کرنا ہی توکل ہے۔ جاہلیت کے
وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کی تردید
کر دی، اور فرمایا کہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار شخص حساب کتاب کے بغیر
جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے، یہ وہ ہوں گے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے، جو بدشگونی کے
قائل نہیں، جو داغ نہیں کرتے، بلکہ اپنے پروردگار پر توکل اور اعتماد رکھتے ہیں۔ ایک دوسری
حدیث میں ارشاد فرمایا کہ "جو داغتا اور تعویذ گنڈا کرتا ہے، وہ توکل سے محروم ہے۔" اس سے
مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہیں، بلکہ جاہلانہ اوہام کی بیخ کنی ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد
ہوا کہ اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے، تو وہ تم کو ویسے ہی روزی پہنچاتا
جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں، اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں۔ اس حدیث
سے بھی مقصود ترک سعی اور ترک تدبیر نہیں، کیونکہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بیٹھا کر روزی
نہیں پہنچائی جاتی ہے، بلکہ ان کو بھی اڑ کر کھیتوں اور باغوں میں جانے اور رزق تلاش کرنے کی ضرورت
پیش آتی ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل و اعتماد سے محروم ہیں، وہ روزی کے لئے دل تنگ

لے شرعی کلمات یعنی قرآن کی سورتیں، اور ان کے علاوہ پاک سے تبرک حاصل کرنا، دعا لیکن
آیات اور دعاؤں کو لکھ کر بدن میں لٹکانا، یا گھول کر پینا، اس قسم کے عقائد کے ساتھ احادیث میں ان کا
ثبوت نہیں۔ ۲ے صحیح بخاری کتاب الطب باب من لم یرق وکتاب الرقاق، وصحیح مسلم کتاب الایمان جلد اول
میں گرم لوہے سے داغ لگانا مراد ہے، عرب داغ لگا کر علاج کرتے تھے۔ ۳ے جامع ترمذی باب ما جاء فی کراہیۃ
الرقیۃ، من اکتوی واسترقی فقد بریٔ من التوکل۔ ۴ے جامع ترمذی
ابواب الزہد صفحہ ۳۸۸، و حاکم۔

صبر

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف)

صبر کی حقیقت پر عام طور سے غلط فہمی نے تو بڑا پردہ ڈال رکھا ہے، وہ اُن کے نزدیک بے بسی اور بے کسی کی تصویر ہے، اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہے، لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی | "صبر" کے لغوی معنی "روکنے" اور "سہارنے" کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا، اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں، بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں، حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کے قصہ میں سورۂ کہف کی آیت میں تین جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ یہی معنی ہیں، حضرت خضرؑ کہتے ہیں

إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا — تم میرے ساتھ صبر نہ کرسکو گے

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا (کہف - ۹) — کیسے اس بات پر صبر کر سکتے ہو جس کا علم تمھیں نہیں۔

حضرت موسیٰؑ جواب میں فرماتے ہیں،

سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا (کہف - ۹) — اگر خدا نے چاہا، تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بےچینی کا پیدا نہ ہونا ہے

کفار، اپنے پیغمبروں کے سمجھانے کے باوجود پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہیں، تو اس کی حکایت انہی کی زبان سے قرآن یوں کرتا ہے

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا (فرقان - ۴) — یہ شخص (پیغمبری کا مدعی) ہم کو اپنے خداؤں سے ہٹا ہی چکا تھا، اگر ہم ان پر صابر و ثابت نہ رہتے،

یعنی اگر ہم اپنے مذہب پر مضبوط اور ثابت قدم نہ رہتے،

یہی مفہوم ایک اور آیت میں ہے، کفار آپس میں کہتے ہیں کہ

اِنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ (ص - ۱) — چلو، اور اپنے خداؤں پر صبر کرو (یعنی مضبوطی کے ساتھ قائم رہو)

عرب کے گنوار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ کے سامنے آکر بدتمیزی کی آواز سے پکارتے

ان سے کہہ دیا گیا کہ اتنی گھبراہٹ کیا تھی، ذرا ٹھہر جاتے

وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتّٰى تَخْرُجَ	اور اگر وہ ذرا صبر کرتے یعنی ٹھہر جاتے،
إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ	یہاں تک کہ تم اے رسول نکل کر ان
(حجرات - ۱)	کے پاس آتے، تو ان کے لئے بہتر ہوتا،

قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی ایک معنی میں مستعمل ہوا ہے، گو حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے، تاہم ان سب کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدمی اور استقامت، صبر کے یہ مختلف مفہوم جن میں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہیں،

وقت مناسب کا انتظار کرنا پہلا مفہوم یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیفیں اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جم کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تعلیم پیش کی تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت میں سرگرم جولاں ہو گیا، ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے، اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مزاحمتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں، تو اس وقت بشریت کے تقاضا سے آپ کو اضطراب ہوا اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی، اس وقت تسلی کا یہ پیام آیا کہ اضطراب و بے صبری کی ضرورت نہیں، آپ استقلال سے اپنے کام میں لگے رہیں، خدا آپ کا نگہبان ہے، خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آئے گا، فرمایا،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ	اے رسول، تو اپنے پروردگار کے

فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ، (طور - ۲)

فیصلہ کا ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے!

فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ، (اعراف - ۱۱)

تو ثابت قدم رہ کر منتظر رہو یہاں تک کہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کر دے،

وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ، (یونس - ۱۱)

اور ثابت قدم رہ کر منتظر رہ یہاں تک کہ خدا فیصلہ کر دے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے،

فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ (ہود - ۴)

ثابت قدم رہ کر وقت کا منتظر رہ، بے شبہ آخر کار کامیابی پرہیزگاروں کی ہے،

اس کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بیکسی، بے یارگی اور بےبسی پاؤں کو ڈگمگا رہی ہو، اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ دلوں کو کمزور کر رہا ہو، حق پر قائم رہو کہ اس کی کامیابی کی پوری امید رکھنی چاہئے،

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ (روم - ۶ - مومن ۶ - ۸)

ثابت قدمی کے ساتھ منتظر رہ، بیشک خدا کا وعدہ سچا ہے،

ایسا نہ ہو کہ وعدہ الٰہی کے ظہور میں اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو، اور باطل کے گروہ میں مل جاؤ۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ

اپنے پروردگار کے فیصلہ پر ثابت قدم رہ

أَمْرًا، فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۚ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ (یوسف-۲)

گھڑ لی ہے تو بہتر صبر ہے اور خدا سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو،

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر میں روک لئے جانے کا حال سُن کر کہتے ہیں،

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ عَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا (یوسف)

بلکہ تمہارے دل نے گھڑ لیا ہے تو بہتر صبر ہے، عنقریب خدا ان سب کو ساتھ لائے گا۔

حضرت ایوب علیہ السلام جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ بامردی سے برداشت کیا، اس کی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی،

إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا ۚ نِّعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ۔ (ص-۴)

ہم نے بے شک ایوب کو صابر پایا کیا اچھا بندہ، وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا تھا

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھکر فرماتے ہیں

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ، (صافات-۳)

اے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے وہ کر گذر، خدا نے چاہا تو مجھے صابروں میں سے پائے گا

بِجَالُوتَ وَجُنُودِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ،

(بقرہ ۔ ۳۳)

ہم میں جالوت اور اُس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں ۔ انھوں نے جن کو خیال تھا کہ خدا سے ملنا ہے یہ کہا کہ بسا اوقات تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم سے بڑی تعداد کے لوگوں پر غالب آئے ہیں، اور خدا صبر و ثبات دکھانے والوں کیساتھ ہے اور جب یہ جالوت اور اُس کی فوج کے مقابلہ میں آئے، تو بولے، اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر بہا، اور ہم کو ثابت قدمی بخش، اور ان کافروں کے مقابلہ میں ہم کو نصرت عطا کر،

اللہ تعالیٰ نے کمزور اور قلیل التعداد مسلمانوں کی کامیابی کی بھی یہی شرط رکھی ہے، اور بتا دیا ہے کہ خدا اُن ہی کا ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں، اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں،

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْآ (نحل ۔ ۱۴)

پھر تیرا پروردگار ان کے لئے ہے جنھوں نے ایذا پانے کے بعد گھر بار چھوڑا، پھر لڑتے رہے، اور صبر و ثبات کے ساتھ ٹھہرے رہے،

دنیا کی سلطنت و حکومت ملنے کے لئے بھی اسی صبر و استقامت کی جو مرید ارشاد کی ضرورت ہے، بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد ارضِ ملک کنعان سے جب سابقہ پڑا، تو حضرت موسیٰ نے ان کو پہلا سبق یہ سکھایا،

قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا	موسیٰ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدا سے
بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوا إِنَّ الْأَرْضَ	مدد چاہو، اور صبر و استقامت سے
لِلّٰهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ	کام لو، بیشک زمین خدا کی ہے وہ
عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ،	جس کو چاہتا ہے، اپنے بندوں میں
	سے اس کا مالک بناتا ہے، اور انجام
(اعراف-۱۵)	پرہیزگاروں کے لئے ہے،

چنانچہ بنی اسرائیل مصر، شام و کنعان کی آس پاس بسنے والی بت پرست قوموں کی آمد سے بہت ڈرتے، لیکن جب انہوں نے ہمت دکھائی اور بہادری و استقامت اور صبر و ثبات قدمی سے کام لینے لگے تو ان کی ساری مشکلیں حل ہو گئیں، وہ کثیر التعداد دشمنوں کے نرغے میں گھرے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر قابض اور دوسری قوموں پر حکومت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی آیت صبر ہی کو قرار دیا ہے، فرمایا

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ	اور ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے
كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ	تھے اس زمین کی وراثت بخشی جس کا

الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا	ہم نے برکت نازل کی ہے، اور تیرے
فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ	پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل
الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ	کے حق میں ان کے صبر و ثبات کے سبب
بِمَا صَبَرُوا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ	سے پوری ہوئی، اور ہم نے فرعون
يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا	اور اس کی قوم کے کاموں کو اور
كَانُوا يَعْرِشُونَ (اعراف ـ ۱۶)	تعمیروں کو برباد کر دیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور — فرعون جیسی جابر قوم کے سامنے میں [illegible] ہوئی کہ اس نے صبر و ثبات قدمی سے کام لیا۔ اور اسی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت عطا فرمائی، چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً	اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے ایسے
يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا	پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے راہ
وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ،	دکھاتے تھے جب انھوں نے صبر کیا،
(سجدہ ۔ ۳)	اور ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔

آیت بالا نے بنی اسرائیل کی گذشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کئے ہیں، ایک احکام الٰہی پر یقین، اور دوسرے ان احکام کی بجاآوری میں صبر اور ثبات قدم، یہی دو باتیں دنیا میں ہر قوم کی ترقی کا سنگ بنیاد ہیں، پہلے اپنے اصولوں کے صحیح ہونے کا پختہ یقین، دوسرے [illegible] اصول کی تعمیل میں ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو خوشی خوشی جھیل لینا۔

اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام ہے، ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف طاقتوں کے پیش آجانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے، اور اپنے مقصد پر جما رہے، اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گذشتہ ناکامی کے قصور کو جو اسی کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے، معاف فرمائے، اور اس کو ثباتِ قدم عطا کرکے حق کے دشمنوں پر کامیابی بخشے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے لئے مسلمانوں کو دو باتوں کی تاکید فرمائی، ایک تو خدا کی طرف دل لگانا، اور دوسرے مشکلات پر صبر واستقامت سے قابو پانا،

دنیا کی فتحیابی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جس کا نام جنّت ہے، اُن ہی کے حصہ میں ہے جن کو یہ پامردی، دل کی مضبوطی اور حق پر ثباتِ قدم کی دولت ملی۔ حق کی راہ میں مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اُن سے کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے اور دونوں الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہیں، چنانچہ فرمایا،

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ	کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے
وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا	اور ابھی تک خدا نے اُن کو
مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۔	الگ نہیں کردیا، جو لڑنے والے
(آلِ عمران - ۱۴)	ہیں اور جو ثابت قدم رہنے والے ہیں

ضبطِ نفس شخصوں اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں، اس وقت نفس پر قابو رکھنا، اور ضبط سے کام لینا مشکل

ہوتا ہے، اگرچہ یہی ضبطِ نفس کا بھی موقع ہوتا ہے۔ اور اسی سے شخصوں اور قوموں میں سنجیدگی
متانت، وقار، اور کیرکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے،

دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت توام ہیں، ان دونوں موقعوں پر انسان کو
ضبطِ نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت و خوشی کے
نشہ میں اس میں فخر و غرور پیدا نہ ہو، اور غم و تکلیف میں وہ ہراساں و بددل نہ ہو، دل کی ان
دونوں کیفیتوں کا نام صبر و ثبات اور ضبطِ نفس ہے، انسانی فطرت کا رازدار کہتا ہے،

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا
رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ
اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ وَلَئِنْ
اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ
مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ
السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ
فَخُوْرٌ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ
(ھود - ۲)

اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے
کسی مہربانی کا مزہ چکھاتے، پھر اس
سے اس کو واپس لیتے تو وہ ناامید اور
ناشکرا ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی
مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا مزہ
چکھائیں، تو کہتا ہے کہ برائیاں
مجھ سے دور ہو گئیں، بے شک وہ
شاداں اور نازاں ہے، لیکن وہ
جنھوں نے صبر (یعنی نفس پر قابو)
رکھا، اور اچھے کام کئے یہ لوگ ہیں
جن کے لئے معافی اور بڑا انعام ہے،

وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً	سے ملایا، اور ان کے صبر کرنے (یعنی
وَّحَرِيْرًا ۝	حکام الٰہی پر ٹھہرے رہنے) کے سبب
(دھر-۱)	باغ اور ریشمی لباس بدلہ میں دیا،

وہ لوگ جو خدا کی درگاہ میں توبہ کریں، ایمان لائیں، نیک کام کریں، فریب کے کاموں میں شریک نہ ہوں، بیہودہ اور لغو کاموں کے سامنے سے ان کو گذرنا پڑے، تو بزرگانہ وضع سے گذر جاتے ہیں، اور خدا کی باتوں کو سن کر اطاعت مندی سے اس کو قبول کریں، اور اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائیں مانگیں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کی یہ بشارت سنائی ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ	ان کو بہشت کا جھروکہ بدلہ میں ملے گا
بِمَا صَبَرُوْا (فرقان ۶)	کہ وہ صبر کرتے رہے،

ان دونوں آیتوں میں صبر کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کاموں کو باوجود خلافِ طبع و تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی صبر کرتے رہے، اور بُری باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام ہے، بچتے رہے، راتوں کو نرم بستروں سے اٹھ کر خدا کے آگے سربسجود ہونا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت سے نماز کے لئے اٹھ کر دوگانہ ادا کرنا، اور نعمت کی لذتوں سے دور ہو کر روزہ رکھنا، تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خطرناک موقعوں پر اپنی جان قبولِ حق کی راہ میں خدا کو آرام و راحت جان کر جھیل لینا، ہر دولت سے الگ رہنا، حسن و جمال کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا غرض شریعت کے

احکام کی بجا آوری اور پھر اس پر عمر بھر استواری اور پائداری، صبر کی بہت ہی کڑی منزل ہے، اور اسی لئے ایسے صابروں کی جزا بھی خدا کے ہاں بھاری ہے۔

ان آیاتِ پاک کی اس تشریح میں وہ حدیث یاد آتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حجبت (حفت) الجنة بالمكاره وحجبت	جنت ناخوشی کے کاموں، اور دوزخ
(حفت) النار بالشہوات (صحیح بخاری	نفسانی لذتوں کے کاموں سے ڈھانپ دی
کتاب الرقاق وصحیح مسلم کتاب الجنۃ)	گئی ہے۔

یعنی نیکی کے ان کاموں کو کرنا جن کا معاوضہ جنت ہے، اس وقت دنیا میں نفس پر شاق گذرتا ہے اور گناہوں کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے اس وقت دنیا میں بڑے پُر لطف، اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں۔ اس عارضی و ہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کئے بغیر احکامِ الٰہی کی پیروی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے۔ کسی دوسرے کے خزانہ، مال و دولت کی فراوانی، اور اسبابِ عیش کی بہتات کو دیکھ کر اگر کسی کے منہ میں پانی نہ بھر آئے، اور محنت بھی، اور حرام کی کثرت کے لالچ کے بجائے مالِ حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت کرے، تو یہ بڑی قوت کا کام ہے، جو صرف صابروں کی [illegible] ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو قارون تھا اس کے مال و دولت کو دیکھ کر بہت سے ظاہر پرست لالچ میں پڑ گئے، لیکن جن میں صبر و برداشت کا جوہر تھا، ان کی چشم بصیرت بھی کھلی ہوئی تھی، وہ ان کو نظر آتا تھا، کہ یہ فانی اور آنی جانی چیز کے دن کی ہے، خدا کی دولت جو نیکوکاروں کو بہشت میں ملے گی، وہ لازوال، غیر فانی، اور جاودانی ہے۔

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ، (قصص - ۸)

جو لوگ حیات دنیاوی کے خواہاں تھی وہ بولے اے کاش ہمارے پاس بھی وہ ہوتا، جو قارون کو دیا گیا، وہ بڑا خوش قسمت ہی اور جنھیں علم دیا تھا، وہ انھوں نے کہا تمھارا برا ہو، اللہ کی جزا ان کے لئے جو ایمان لاتا، اور نیک کام کرے سب سے بہتر ہے، اور یہ حقیقت کو وہی پا سکتے ہیں، جو صابر ہیں،

یہ جزا بہتر سے بہتر ہوگی، کیونکہ یہ اس خزانے سے ملے گی جو لازوال اور باقی ہی

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، (نحل - ۱۳)

جو تمھارے پاس ہی وہ چک جائیگا، اور جو خدا کے پاس ہی وہ رہنے والا ہے، اور یقیناً ہم ان کو جنھوں نے صبر کیا انکی مزدوری ان کے بہتر کاموں کے بدلے دینگے

ایک اور جگہ فرمایا کہ نماز قائم کر کہ نیکیاں بدیوں کو دفع کرتی ہیں اس پیغام میں نصیحت قبول کرنے والوں کے لئے نصیحت اور یاددہانی ہے، اس کے بعد

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ

اور صبر کر کہ بے شبہ اللہ نیک کام

اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (ھود-۱۰)

کرنے والوں کی مزدوری کو ضائع نہیں کرتا

صبر کے فضائل اور انعامات

یہ مزدوری کیا ہوگی؟ یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی،

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ
بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ (زمر-۳)

صبر کرنے والوں کو تو اُن کی مزدوری
بے حساب ملے گی،

جن محاسن اور محامد صفات اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے، اُن میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ
وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ
وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَ
الصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ
وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَ
الْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَ
الْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ
وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ
وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَ
الْحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ
کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰہُ

بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں
اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں،
اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے
والی عورتیں، اور محنت سہنے والے مرد
(صابرین) اور محنت سہنے والی عورتیں
(صابرات) اور (خدا کے سامنے) جھکنے
والے مرد اور جھکنے والی عورتیں، اور
خیرات کرنے والے مرد اور خیرات
کرنے والی عورتیں، اور روزہ دار مرد
اور روزہ دار عورتیں، اور اپنی شرمگاہ
کی حفاظت کرنے والے

اس آیت میں ایک عجیب نکتہ ہی، اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے ہوا اور خاتمہ بھی دعا پر ہی، اور ان دونوں کے بیچ میں اُن کے چار اوصاف گنائے ہیں جن میں پہلا درجہ صبر یعنی محنت سہارنے تکلیف جھیلنے، اور پامردی دکھانے کا ہی، دوسرا راستی و درستی کا، تیسرا خدا کی بندگی و عبودیت کا، اور چوتھا راہِ خدا میں خرچ کرنے کا.

فتح مشکلات کی کنجی صبر اور دعا بعض آیتوں میں ان تمام اوصاف کو صرف دو لفظوں میں لیا گیا ہے، دعا اور صبر، اور فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزیں مشکلات کے طلسم کی کنجی ہیں، یہود جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول نہیں کرتے تھے. اس کے دو سبب تھے ایک یہ کہ ان کے دلوں میں اثر اور رقت نہیں رہی تھی، اور دوسرے یہ کہ پیغام حق قبول کرنے کے ساتھ ان کو جو جانی و مالی دشواریاں پیش آتی تھیں یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے خوگر ہو کر ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبِ روحانی نے ان کی بیماری کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا،

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ-۵)	اور صبر (محنت جھیلنے) اور دعا مانگنے سے قوت حاصل کرو

دعا سے ان کے دل میں اثر اور طبیعت میں گداز پیدا ہوگا، اور صبر کی عادت سے حق کی راہ کی مشکلیں دور ہوں گی. ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانوں کے برخلاف تلواریں اٹھائیں اور مسلمانوں کے ایمان کے امتحان کی ترازو میں تلنے کا وقت آیا، تو یہ آیتیں نازل ہوئیں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا	اے ایمان والو، صبر (ثابت قدمی)
بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ إِنَّ اللّٰهَ	اور دعا سے قوت پکڑو، بیشک خدا

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً	درحقیقت ابراہیم دین کی راہ ڈالنے
قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَلَمْ يَكُ	اور اللہ کا فرمانبردار، اس کی ایک سمت
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ شَاكِرًا	والا تھا، اور شرک کرنے والوں میں
لِّاَنْعُمِهٖ اجْتَبٰهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى	سے نہ تھا، اللہ کے احسانوں اور نعمتوں
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ،	کا شکرگذار، اللہ نے اس کو چن لیا،
(نحل - ۲)	اور اس کو سیدھی راہ دکھائی،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانوں کی شکرگذاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے، احکامِ الٰہی کی پیروی کی جائے، اور شرک سے پرہیز کیا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائے گا، اور ہر علم و عمل میں ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا۔

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ، دین کی اصل اور طاعتِ الٰہی کی بنیاد ہے، یہ وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت، اور محبت پیدا ہونی چاہئے، اسی قدر و عظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کا نام شکر ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ	اگر تم شکر کرو، اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو
شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ	عذاب دے کر کیا کرے گا، اور اللہ تو
اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (نساء - ۲۱)	قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہے،

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے، شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے، اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے، وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے، ساری عبادتیں

شکر ہیں۔ بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے۔ دولتمند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے، تو یہ دولت کا شکر ہے۔ صاحب علم اپنے علم سے بندگان الٰہی کو فائدہ پہنچاتا ہے، تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے۔ طاقتور کمزوروں کی مدد اور حفاظت کرتا ہے، تو یہ بھی قوت و طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے۔ الغرض شریعت کی اکثر باتیں اسی ایک شکر کی تفصیلیں ہیں۔ اسی لئے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہوں گے، تو یہ کہا،

وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ۔ (اعراف-۲) — اور تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائیگا۔

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا،

وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ (آل عمران-۱۵) — اور ہم شکر کرنے والوں کو جزا دیں گے

پوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں دیتا ہے،

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشَّاكِرِينَ (زمر-۷) — بلکہ اللہ کی بندگی کرو اور شکر گذاروں میں سے ہو،

شکر کے اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں کبھی اپنا مال دے کر اس فرض کو ادا کرتے ہیں، زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن کی اصطلاح میں حمد ہے جس کے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے، سب سے پہلی سورہ حمد ہی ہے، اللہ تعالیٰ کے ان اوصاف کاملہ کا ذکر ہوتا ہے جو انسانوں

محروم ہوں یا کسی عضو سے بیکار ہوں، مالی نعمتوں کا شکر یہ ہے کہ جو اس نعمت سے بے نصیب ہوں، اُن کو اس سے حصہ دیا جائے، بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے، پیاسوں کو پانی پلایا جائے، ننگوں کو کپڑا پہنایا جائے، بے سرمایوں کو سرمایہ دیا جائے،

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد شکر الٰہی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لئے ہر آیت میں اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے،

تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ	بڑی برکت اس کی ہے، جس نے آسمان
بُرُوجًا وَّجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا	میں برج بنائے، اور اس میں ایک چراغ
وَّقَمَرًا مُّنِيرًا، وَهُوَ الَّذِي	اور چمکتا ہوا چاند رکھا، اور وہی ہے جس
جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً	نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک
لِّمَنْ أَرَادَ أَنْ يَّذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ	آتا ہے اس کے واسطے جو دھیان رکھنا
شُكُورًا ۝ (فرقان - ٦)	یا شکر کرنا چاہے

اس میں اپنی قدرت کی نعمتوں کا ذکر کرکے شکر کی ہدایت ہے، یہ شکر اسی طرح ادا ہوسکتا ہے کہ اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کریں، اور دن کی روشنی اور چاند کے اُجالے اور رات کے سکون میں ہم وہ فرض ادا کریں جس کے لئے یہ چیزیں ہم کو عطا کر دی گئی ہیں، دوسری آیتوں میں ہے،

......الرَّحِيمُ الَّذِي أَحْسَنَ	...... بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی
كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ	جو چیز بنائی، اور انسان کی پیدائش شروع کی

الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ، ثُمَّ جَعَلَ	سے شروع کی، پھر اس کی اولاد کو بے قدر
نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ	سے نچڑے ہوئے پانی سے بنایا، پھر
مَّهِيْنٍ، ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ	اس کو درست کیا، اور اس میں اپنی
مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ	روح سے کچھ پھونکا، اور تمہارے
وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا	کان، اور آنکھیں، اور دل بنائے تم
مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (سجدہ ۱-۵)	کم شکر کرتے ہو،
وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ	اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے
اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ	پیٹوں سے باہر نکالا، تم کچھ جانتے نہ
جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ	تھے، اور تمہارے لئے کان اور آنکھیں
وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (نحل)	اور دل بنائے تاکہ تم شکر کرو،

ان آیتوں میں خلقتِ جسمانی کی نعمت کا بیان اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت و کبریائی اور یکتائی کو تسلیم کریں، اور یہ کہیں کہ جس نے یہ زندگی دی، اور اس زندگی میں ہم کو یوں بنا دیا، وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے، اور اس میں ہم کو یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے، اور پھر پاکیزہ و اچھی کھانوں سے اس کے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کریں بعض اور آیتوں میں بیان ہے،

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ	تو ان جانوروں کے گوشت میں سے

وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ،

کچھ آپ کھاؤ، اور کچھ اُن کو کھلاؤ، جو صبر سے بیٹھا ہے یا محتاجی سے بے قرار ہے، اسی طرح ہم نے وہ جانور تمہارے قابو میں دئے ہیں تاکہ تم شکر کرو،

(حج - ۵)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ، (بقرہ - ۲۱)

اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو روزی دی، پاک چیزوں میں سے کھاؤ، اور خدا کا شکر کرو،

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (نحل ۱۵)

تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزیں روزی کیں اُن کو کھاؤ، اور اس کی نعمت کا شکر کرو، اگر تم اُسی کو پوجتے ہو،

یہ مالی نعمت کا بیان تھا، اس کا شکریہ بھی خود کو ان کے ذریعہ ادا کریں، دنیا میں شکریہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کریں، لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ نہیں کیا جا سکتا، اس تیسری قسم کے شکریہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو، اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندوں کے ساتھ کریں اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے،

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ

اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی

پلایا، بندہ کہے گا، اے میرے پروردگار! تو تو سارے عالم کا پروردگار ہے، میں تجھ
کیسے پانی پلاتا، فرمائے گا، میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا، تو نے اس کو نہیں
پلایا، اگر تو اس کو پلاتا تو آج تو اس کو میرے پاس پاتا۔ [1]

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا جانی اور مالی شکریہ ہم کو کس طرح
ادا کرنا ہے اور اس کا قرض ہم کو کیونکر اتارنا چاہئے،

اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لئے بھی کیا ہے کہ ہم یہ
نہ سمجھنے لگیں کہ خدا کے فضل و کرم کے سوا ہم ان نعمتوں کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے یا
اُن کے لئے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا، نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی یا عملی، جو کچھ ملا، اس کے فضل و
کرم سے ملا، اور جو کچھ ملے گا، وہ اسی کی عطا اور بخشش ہوگی۔ انسان اپنی روزمرہ کی متواتر بخششوں
کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں، دیکھ کر، اور اُن کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے
ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہیں، بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے جس کے شکریہ کی کوئی ضرورت
نہیں مگر خوب سمجھنا چاہئے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحاد کی کونپلیں نکلتی ہیں، اسی لئے اللہ
تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوایا ہے، اور اس پر شکر ادا کرنے کی
تاکید فرمائی ہے، تاکہ ربوبیت الٰہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے، اور بار بار یاد دلائے
کہ لذت و نعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے کوئی بلند تر ہے
اور جو اس کو ملا ہے وہ اس کا خاندانی حق تھا یا اُس کے ذاتی علم و ہنر کا نتیجہ تھا، جیسا کہ قارون نے

---

[1] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض،

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

(نحل-۲)

اور اسی نے سمندر کو تمہارے بس میں کر دیا، کہ تم اس سے تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ، اور اس سے آرائش کی وہ چیز نکالو جس کو تم پہنتے ہو (یعنی موتی) اور تم جہازوں کو دیکھتے ہو، کہ وہ اس میں پانی کو پھاڑتے رہتے ہیں، اور تاکہ تم خدا کی مہربانی ڈھونڈو، اور تاکہ تم

كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (حج-۵)

اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے بس میں کر دیا، کہ تم شکر کرو

وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ،

(قصص-۷)

اور اس کی رحمت سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن بنائے کہ تم (رات کو) آرام اور (دن کو) اس کے فضل و کرم کی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو،

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتیں ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے یہی ظاہر فرمایا ہے کہ ان ساری نعمتوں کا منشا یہ ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچانے اور دل سے اس کا احسان مانے لیکن گنہگار انسان کا کیا دل ہے۔

اِنَّ اللہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَشْکُرُوْنَ۔ (یونس-۶)	اللہ نے انسانوں پر بڑے بڑے فضل کیے، لیکن اُن میں سے بہت کم شکر کرتے ہیں،
وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ۔ (اعراف-۱)	اور ہم نے تم کو زمین میں قوت بخشی، اور اس میں تمھارے لئے بسر اوقات کے بہت سے ذریعے بنائے، تم بہت کم شکر کرتے ہو،

ایک موقع پر تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ناشکری پر پُرمحبت غضب کا اظہار بھی فرمایا:-

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَکْفَرَہٗ (عبس)	مرے جائیو انسان کتنا بڑا ناشکرا ہے،

شکر کے باب میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں، کہ ہم نے زبان سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہ پڑھ دیا، تو ہم سے شکر ادا ہوگیا، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، شکر دراصل دل کے اس لطیف احساس کا نام ہے جس کے سبب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہیں، ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں، اور اس کے لئے سراپا سپاس بنتے ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کو خوش رکھ سکیں، اور اس کی فرمائشوں کو پورا کرتے ہیں، اگر ہم صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کریں لیکن دل میں احسان مندی، اور منت پذیری کا کوئی اثر اور کیفیت نہ ہو اور اس اثر اور کیفیت کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو تو ہم اس محسن کی احسانمندی کے اظہار میں جھوٹے ہیں، اور وہ شکر خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو اپنے بیدریغ احسانات

سے جس طرح نوازا، اس کے بیان کرنے کے بعد اُن کو خطاب کرکے فرماتا ہے،

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۔ (سبا-۲)

اے داؤد کے گھر والو شکر ادا کرنے کے لئے نیک عمل کرو،

اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو، بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہیے، اسی لئے حضرت سلیمانؑ خدا سے دعا کرتے ہیں،

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ ، (نمل-۲)

اے میرے پروردگار! مجھے نصیب کر کہ میں تیرے اُس احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا ہے شکر کروں، اور وہ نیک کام کروں جو تجھے پسند ہو،

اس دعا میں بھی یہ اشارہ ہے کہ شکر میں شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق مناسب نیک عمل بھی ہو،

دل میں یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گزار بندوں کے حق میں جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے جیسے شکر کرتے جائیں گے، میں اُن کے لئے اپنی نعمتوں کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤں گا، اس کی تاویل یہ ہے کہ بندے جیسے جیسے نیکی کے شکر کے ذریعے اپنے عمل میں سرگرم ہوتے جاتے ہیں، اس کی طرف سے بندوں کی ہر نئی سرگرمی کے جواب میں اُن کو نئی نئی نعمتیں عنایت ہوتی جاتی ہیں، اسی لئے فرمایا،

خاتمہ

کتاب کی پانچویں جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل ہے ختم ہو گئی، ان صفحات میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ان تعلیمات کا بیان ہے جو عبادات کے باب میں آپ نے فرمائی ہیں، ان تعلیمات کے ایک ایک حرف پر غور کیجئے کہ آنحضرت نے وہم پرستیوں اور غلط فہمیوں کے کتنے تو برتو پردے چاک کر دیئے، اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جزو ہے اس کی حقیقت کتنی واضح کر دی، عبادات کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائے، اور آپ نے وہ انسانوں کو بتائے، وہ کتنے مکمل کتنے جامع اور ان میں کا ایک ایک آئین آپ کے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متین اور مفصل اور دین و دنیا کی مصلحتوں اور فائدوں پر مشتمل ہے، اور آپ نے ان کے ذریعہ انسانی دلوں کی کمزوریوں اور روح کی بیماریوں کا کس طرح علاج فرمایا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور تعلیمات کی کوئی حد نہیں ہے، اور ان ہی میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کی ہر تعلیم جس میں عبادت بھی داخل ہے عموماً صاف و صحیح اور یقینی ہے، اور زندگی مابعد میں انسانی روحانیت کی پیمائش اور قیاس آرائیوں سے مبرا ہے اور اس کا اثر

ہونا اس لئے ضروری تھا، کہ اس پر نوعِ انسان کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے، اسلئے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہیئے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی آمد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے، نبوت و رسالت کے آخری معلم نے (خدا اُن پر اپنی رحمتیں اور برکتیں اُتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا، جس سے زیادہ کا تصور نہیں ہو سکتا،

صَلَوَاتُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَ بَرَکَاتُہٗ

مغفرت کا طلبگار

"سید سلیمان ندوی"

۱۲ جمادی الثانی سنہ ۱۳۵[illegible]ھ